کلام جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ
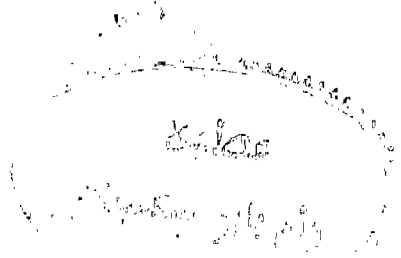
مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

قیمت مر

طبع پنجم سنہ ۱۹۳۸ء ۲۰۰۰

مطبوعہ لطیفی برقی پریس دہلی

مولانا محمد علی جوہر مرحوم

جوہر اور ان کی شاعری

از

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی۔ اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ا)

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان
ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔
رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر،
تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رامپور
کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق
ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی
ذوالفقار علی خانصاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خانصاحب
اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خانصاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ
ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خانصاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری
پر رہتی تھی، از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ
مخصوص سرکار بے کار ان کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس
لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف
اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو)

آیا دہلی سے ایک مشکی خر — آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ؎

آج رخصت جہاں سے داغؔ ہوا خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغؔ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغؔ نے پہلے دن پوچھا "کچھ شعر بھی یاد ہیں"۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دئے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے انھیں کے چند شعر انھیں سنا دئے، سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے سنئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۶۳ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری official biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے، ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال

یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی (جو
محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی
ہے تو چڑیا چڑونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے،
مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں
بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جواب دہی ہمارے سر آپڑے۔ آپ نفسیات کے ماہر
ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرۃ نگار باوجود نقاد سخن ہونے کے محض
لطف پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ
میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر
ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کے نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب
انکشافات سے مالامال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو۔ اور
اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ
میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنئے گیارہ
برس کی عمر میں علیگڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی
مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا
اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک
شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل نا واقف ہے۔
مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد
کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرع طرح
اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔

میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اُسی لچر پوچ کا تھا۔ میں
اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام
تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر
ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔
مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ
آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ
انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب
(تربیت الدجاج دلو تین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن
میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب
آنریبل وزیر حسن موجودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے پدر بزرگوار۔ خیر ایک سال
آخری کالج میں خوب گذر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعد کو حسرت نے رونق بخشی، ہم
لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی
تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین
چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت
میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں — لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علیگڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی
ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی
ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔

مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستورِ عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالاتِ گرد و پیش اس کے محرک تھے جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی، بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشقِ حقیقی نے رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور رہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو لکھا ہے۔ مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوتِ قرآن پاک کے) تسکینِ قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں (Touch Stone) کی کسوٹی سے زیادہ قابلِ قدر نہیں (A Poor Thing but mine own)

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیعِ اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ . . . . . (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا اُن کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے۔ تاریخ اس پر ۱۶؍ اگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اُس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۹۱۶ء کے شروع میں اُسی نظر بندی کی حالت میں، ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی، پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں۔ کسی والا نامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیتے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے، ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا، آپ اوپر پڑھ چکے، بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کر کے، ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کر کر کے لکھے جاتے ہیں؟ . . . . بیچارے کو خیال تک نہ ہوگا کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی!

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اول اول جانا، تو اس حیثیت سے، کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علیگڑھ کے فدائی ہیں، "قوم" کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں، پرجوش ہیں، ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے

قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے - یا (کانگریسی اردو میں) "چنے گئے"! لوٹ کر آئے
بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے - ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع
کی، شہرت اور بڑھی سنہ ۱۹۱۱ء آگیا - کلکتہ سے کامریڈ نکالا - حاکموں اور محکوموں انگریزوں
اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی - نثر میں شاعری!
واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی، اور
کلب میں بھی شیکسپیر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خوب لکھدی! مسلم یونیورسٹی کے
نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! سنہ ۱۹۱۲ء آیا - کامریڈ کو دلی لائے
یہیں سے ہمدرد بھی نکالا - اب محمد علی ایڈیٹر نہ تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر، صحیح
معنی میں لیڈر تھے، اب قوم اُن کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے! جنگ طرابلس کے
بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی بے خودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں
کی ہر ضرب، ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علی کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور نہ بن پڑی
تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا - چندہ کے لئے
پکارا، تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا - اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونین پیش
آگیا، محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! . . . . اب ان کا
شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے!
ہاں مستِ الست! -

ولایت گئے اور آئے - گرجے برسے، چلائے - دم لینے نہ پائے تھے، کہ
سنہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی . . . . . . خلافت اسلامیہ کی
جنگ! آہ، کہ وہ آخری جنگ، جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا . . . محمد علی

اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی، تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی جیتے و جینے کی نہیں اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانے میں چمکے مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہیں　　　اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اُس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں، مہر ہی مہر، لیکن حقیقت مہر بھی کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ، سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان بر امتحان سوز بر سوز، ابتلا بر ابتلا ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر　　　عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر!

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر　　　دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے!

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصودِ پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لئے نقد جان کا مطالبہ ہوتا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا　　　کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے، حصہ بقدر جثہ

یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے، کیا خوب مصرعہ لگایا ہے، یہ خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے! اسی نظربندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا، ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کروں!

نظربندی اور اُس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پینترے! ادھر ہندوستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع ۱۹۲۰ء تھا، کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے۔ اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں، وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہا لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا، چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی!

اذاں حرم میں، کلیسا میں ریڈیں تو کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا "عدم تشدد" برابر کہہ دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہرحال جرم ہی تھا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علیگڑھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے اور ۱۹۲۳ء تک، کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں

ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ، سرکار دالاتبار کے مہمان! . . . اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین، رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامت!

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن مذہب سے عزیز تر، دنیا، دین پر مقدم۔ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالا تر، وہی نعرۂ تکبیر! . . . وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر کیسا کچھ پھڑ پھڑایا ہوگا! دل پر کیا کچھ بیت رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا و درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو، وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ — اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

بھرا نے، اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، اور گڑگڑا، گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جِلا سکتا ہے، قرآن میں کیا — تُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیّت مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت سے کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے، اُس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اُسے قبر میں بھی اتارا!

سنہ ۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھئے کہ محمد علی پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خیر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط سنہ ۲۴ء سے آغاز سنہ ۳۱ تک زندہ ضرور رہے، اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔

سنہ ۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد سنہ ۲۹ء میں اُسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا، ہمدرد نکالا۔ مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آتے۔ یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا لیکن

دل کی کلی جو الغائے خلافت سے مرجھا چکی تھی، پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہیئے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے! . . . . . . اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہِ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں سفرِ آخرت! بدبینوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یہ ایک متحرک کوہِ آتش فشاں! فاتح در بلا کہا، جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے، کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر!" مالک نے بندے کی لاج رکھ لی، جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان سنہ ۱۳۵۰ھ کی پندرھویں شب میں عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے نعمت عظمٰی دنیائے اسلام سے واپس لے لی! . . . . . شاید اس لئے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے! "آزادی" محمد علی کے ملک کو کیا ملتی، محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزار دل داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں، قبلۂ اول، ہیکل سلیمانؑ کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبال نے کہا، ذرا دیکھنا

محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی، محمد علی، جا کس راستے سے رہا ہے۔ ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت!

اس موت پر، اس مدفن پر، رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اُس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں مقبرہ ایک زیارت گاہِ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی نہ دیباچے کی، نہ پیش نامہ کی۔ ورق اُلٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجیے پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہیے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پُرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں، تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علیؒ ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے۔ اُس

سن کا کھیل کو ذرا ملاحظہ ہو ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو — مگر اے ہمنفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا — تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں — پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش — تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا — دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں، انگریزی سنہ ۱۹۰۷ء ہے۔ علیگڑھ، محمد علی کے محبوب علیگڑھ میں لڑکوں نے انگریز استاد کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشاں! بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوتے ہیں مگر اتنے عرصے میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں، اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے، اولڈ بوائز، جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں، محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے لرزتے نہیں ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں، اپنے جیتے "بڑے لڑکوں" کو سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو — ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو — وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڑھ میں — اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا   جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تمھیں ہو زندۂ جاوید، باقی جانیوالے ہیں   نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشا پرداز کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سر شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضائے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی، اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین   کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے   ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند، بادۂ حق کے   ابھی دو چار خم پئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی   کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ   ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح نہ ترمیم بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے۔ یہی حال نثر کا ہے یہی حال نظم کا۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظر بندی" کا تھا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت "نظر کشائی" کا قرار پایا! خوب خوب پتے پتے کی کہنے لگے ؎

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو — ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے تھک کر گئے اُسے — اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنئے!

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے — یہ کیا کہ سے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا — جو تھی وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو — باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

"جینا" کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا، لیکن ذرا دیکھئے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل — ھل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہر حال ایک مسلّم استاد تھے، جو ہر ان کے مقابلے میں بلندی اور نو آموز محض پھر بھی شعر کچھ ایسا بیٹھا نہیں رہا ؎

لذتِ سوز مائدۂ عشق میں نہیں — آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر گلیوں میں، گھر گھر، زبانوں پر چرچا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ کہنا تو محمد علی کی "بی اماں" کا تھا، اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے　　پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو　　خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے، یا اپنی آٹوبیاگرفی (خود نوشت سوانح عمری) "آپ بیتی" قلمبند فرما رہے رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا　　سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت　　پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے
کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے　　اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے　　ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا، تو صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا۔

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا، یا تعزیت نگار کو عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔

جسم قید فرنگ میں۔ دل ترکوں میں اٹکا ہوا جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو، ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود، یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے، اس کے باب میں
کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی

تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہ
ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رامپور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، بڑھے تھے، کھیلے تھے، جیسے جیسے دل میں بسا ہوا تھا۔ مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ یا کسی کو یہ مستقل جلا وطنی بھگتنی پڑے، جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں، اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے — ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے
ایک اک کرکے سب نکلے — ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھئے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی قیدِ تنہائی! بجا پور جیل کی کال کوٹھری کے اندر، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں! سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا کیا کچھ دکھا دیا! راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان، درود خوانی کرلی تو کچھ آتے آتے اس عالم کے بھی دیتی چلی گئی ؂

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے — ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے — ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس قید پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزاروں آبادیاں! مشتِ خاک کا شمار اب عالمِ پاک میں تھا۔ لوہا جب، تپ کر، دہک کر لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جوہر اب عالمِ معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حرف کی رہ کہاں گئی تھی! ایک دیوانہ تھا، دیوانہ جسے ایک دوسرے دیوانے نے، بلا کسی ظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا، اور خوب ہی کہہ ڈالا ؂

بدین مصطفٰی دیوانہ بودی | فدائے ملت جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی | وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت | ز آئین خرد بیگانہ بودی
رسیدی از رہِ اعتبار تا یار | عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن، نظم کے باقی اشعار سیرت محمد علی میں ہیں۔)

زبان پر آئی ہوئی "واہ" کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل کی نکلی ہوئی "آہ" کی رسائی مالک عرش تک! رومی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح بھی ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہوگئے، محاورات تبدیل ہوگئے، ترکیبیں نئی ہوگئیں لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہرنے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کر دیا تھا، عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی اُن کے نصیب میں بھی آجائے!

عبدالماجد

۲۶ ستمبر ۱۹۳۵ء
دریاباد - بارہ بنکی

قطعات

عرضداشت بخدمت سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور

جو ۱۹۱۰ء میں مرحوم کی برسی کے لئے لکھی گئی اور اولڈ بوائز ڈنر میں پڑھ کر سنائی گئی

بیاں کس طرح ہو اے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو
ہمارے عاشق دلدادہ تم ہو دلربا تم ہو

تمہیں تھے پیشوائے قوم جب تک جان تھی تن میں
مگر سید، مرے پر بھی ہمارے پیشوا تم ہو

خیر لو قوم کی کشتی کی، گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

کرو اس قوم کے حق میں دعا اے سید احمد خاں
کہ معتوب الٰہی ہم ہیں، مقبول خدا تم ہو
بہت تھے باخدا دنیا میں جب تم ایک کافر تھے
مگر وارالجزا میں شک نہیں، اک باخدا تم ہو
نہ ہوں بیدل تمھارے بعد لڑکے قوم کے کیونکر
ہمارا دل تمھاری قبر میں ہے دلربا تم ہو
تمھارے جذبۂ دل کا اثر اب تک نمایاں ہے
فدا ہے تم پہ کالج، کیونکہ کالج پر فدا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڑھ میں
اور اُس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو
تمھاری روح منڈلائی ہوئی پھرتی ہے کالج پہ
قفس خالی ہے، لیکن عندلیب باوفا تم ہو
لحد پر تیری کشکول گدائی سایہ افگن ہے
کہ زیر چرخ، زیر خاک بس قومی گدا تم ہو
صف آخر میں سرداروں سے رہتے تھے جو دنیا میں
تعجب کیا صف اول میں گر روز جزا تم ہو

جنھیں احساس ہے قومی محبت کا وہی جانیں
نہیں معلوم جن کو، کیا کہیں اُس سے کہ کیا تم ہو
سوا اللہ کے ہم کو نہیں امید غیروں سے
سہارا ہے محمد کا ہمیں دنیا میں یا تم ہو
ملا ہے تم کو ورثہ قوم کی مشکل کشائی کا
عزیز مصطفیٰ تم ہو، عزیز مرتضیٰ تم ہو
حسین ابن علی کا تم سکھاتے ہو سبق ہم کو
کہ کالج کے محرم میں بھی یادِ کربلا تم ہو
ید اللہ چوم کر جب تک تم آنکھوں سے لگاتے ہو
تو ہم ہرگز نہ مانیں گے کہ اب بے دست و پا تم ہو
نئی خواہش نہیں کچھ قوم کی ہم تم کو روتے ہیں
ہماری آرزو تم ہو، ہمارے مدعا تم ہو
سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تم عاشق قوم کے ہو، اور سب معشوقِ امت ہیں
جو پابند جفا ہیں وہ تو پابند وفا تم ہو

تمہارے جانشیں پیرو نہیں اگلے اصولوں کے
جو پگڈنڈی ہیں ٹیڑھی ہم تو سیدھا راستا تم ہو
رہا کرتے تھے اکثر سرگراں تم، ہم سبک ٹھہریں
جو تعبیر بد ملت ہم ہیں تفسیر حیا تم ہو
تمہیں ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیل بقا تم ہو
تمہارے دوستوں[1] کو ضعف دل ضعف بصارت ہے
دلاسا تم ہو پیری کا، اندھیرے کا دیا تم ہو
بتا دو صاف رستہ ہم کو تم قومی ترقی کا
کہ ہم گم کردہ رہ ہیں اور ہمارے رہنما تم ہو
وقارالملک کی قوت ہو، حالی کی زباں ہو تم
تو مہر مہدی[2] امت کی بس آنکھوں کی ضیا تم ہو
یہی کافی نہیں ہے، قوت بازو ہی ہو ان کی
اور ان کے قلب کو قوت ہو، سینے کی صفا تم ہو

---

(۱) و (۲) اشارہ ہے نواب محسن الملک مہدی علیخاں سکرٹری کالج کی جانب

جو ہیں محتاج رہبر افسرانِ مدرسہ سیّد
تو بک[1] مرحوم یہ کہہ دو کہ ان کے رہنما تم ہو
یہ سب کچھ ہو، مگر ان اولڈ بوائز سے بھی تو کہہ دو
تمھیں محسن بنو اس کے وقارِ اِس قوم کا تم ہو

(۱) ہنرڈورکب۔اول پرنسپل علیگڑھ کالج۔

استقبال رمضان

الٰہی شکر ترا، پھر مہِ صیام آیا
مہِ صیام نہیں عید کا پیام آیا

ہزار ماہ سے بہتر ہے ایک رات اس کی
اسی مہینے میں اللہ کا کلام آیا

گھڑی وہ کیسی مبارک تھی کل جہاں کے لئے
حرا میں عرش سے اترا رسا جب پیام آیا

جب اپنی پوری جوانی پہ آ گئی دنیا
تو زندگی کے لئے آخری نظام آیا

میں اس پہ بھیجوں درود و سلام کس منہ سے
کہ جس کے نام خود اللہ کا سلام آیا

ہے زندگی تو اسی کی جو مر مٹا دیں پہ
وہی ہے کام کا اسلام کے جو کام آیا

ہو نفخ صور تمھارے لئے صدائے رحیل
ہو جاں بلب بھی تو کہہ دو ابھی غلام آیا

نبی سے ملتے ہی اسلام کی سپر تھا وہی
جو بنا کے کفر کی شمشیر بے نیام آیا

وداعِ رمضان

الوداع اے ماہ رمضاں الوداع
بہترینِ غمگساراں الوداع

تجھ میں اترا آخری پیغام حق
تو ہی تھا شایانِ قرآں الوداع

ان دنوں تھا بحرِ رحمت جوش پر
اے زبانِ عفوِ عصیاں الوداع

الفراق اے ہمنشینِ صائمین
مونسِ شب زندہ داراں الوداع

آشکارا تجھ پہ تھا سب از دل
پردہ دارِ دردِ پنہاں الوداع

تجھ سے تھیں وابستہ امیدیں تمام
دافعِ صد یاس و حرماں الوداع

قیدِ تنہائی کی رونق تجھ سے تھی
اے شریکِ بزمِ زنداں الوداع

غنچہ ہائے دل شگفتہ تجھ سے تھے
اے بہارِ باغِ ایماں الوداع

دور کر دی تو نے ظلمت قید کی
تجھ سے ہر شب تھا چراغاں الوداع

ہوتے ہیں اب رخصت افطار و سحر
میزبانیہائے مہماں الوداع

سونپنا تھا تجھ کو زادِ آخرت
ہو سکا پر کچھ نہ ساماں الوداع

کاروانِ خیر و برکت چل دیا
رہ گئے سب دل میں ارماں الوداع

شدتِ غم سے زباں گر بند ہے
تو ہی کہہ دے چشمِ گریاں "الوداع"!

ہائے غلام حسینؒ [1]

۱۹۱۷ء

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے

اے مرے رند بادۂ حق کے — ابھی دو چار خُم پیے ہوتے

تم تو دل بھی فگار کر کے چلے — زخم ہائے جگر سیئے ہوتے

یوں نہ دامن چھڑا کے چل دیتے — تم گر اس بزم کے لیے ہوتے

تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیئے ہوتے

---

[1] راجہ غلام حسین مرحوم (پنجابی) حضرت جوہر کے مخصوص دوستوں اور شاگردوں میں تھے۔ علیگڈھ کے ایک ممتاز ترین گریجویٹ۔ انگریزی کے ایک بہترین صاحب قلم۔ کامریڈ (دور اول) کے سب ایڈیٹر رہے اور بارہا ایسے ایڈیٹوریل لکھے کہ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کے رنگ میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ مولانا کی نظر بندی کے بعد کچھ روز لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف میں کام کیا۔ اس کے بعد اپریل ۱۷ء میں اپنا ذاتی ہفتہ وار نیو ایرا (NEW ERA) کے نام سے لکھنؤ سے نکالا۔ اگست ۱۷ء میں ایک اتفاقی حادثے سے عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔

تھی شہادت کی کس قدر جلدی ۔۔۔ کام کچھ اور بھی کئے ہوتے

خوب کشتہ بہشت کا رستہ ۔۔۔ ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تم ہی زندہ ہو لغو ہی یہ خیال ۔۔۔ چند دن اور بھی جئے ہوتے

آج جو سر ہیں دل کے قاش فروش

کاش کچھ اور تاسفے ہوتے

شانِ کلکتہ

(واقعاتِ کلکتہ ۹، ۱۰، ۱۱ ستمبر ۱۹۱۸ء)

اللہ رے پڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ
روحِ رسول آج ہے مہمانِ کلکتہ

یثرب کی خاکِ پاک کے ہر ذرہ کے لئے
سو جان سے فدا ہیں غلامانِ کلکتہ

ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخ پوش
ہے آج گل بہار پہ ایمانِ کلکتہ

تھا چونکہ خارِ راہ سے بیخوف اس لئے
پھولوں سے بھر دیا گیا دامانِ کلکتہ

ہے شور آسمان و زمیں پر ہٹو، بچو
ہیں عازمانِ خلد شہیدانِ کلکتہ

ابتک دلوں میں تازہ ہے قالوبلیٰ کی یاد
البتہ استوار رہے پیمانِ کلکتہ

ہو زورِ کفر و شرک سے مرعوب کس لئے
اللہ خود ہے جسکا نگہبان کلکتہ

پہلے سے بڑھ کے آج ہے یہ پائے تختِ ہند
شکلِ ملک کی سر آنکھوں پہ فرمان کلکتہ

ہے امتحانِ منافق و مومن کا دوستو
میزانِ حشر بن گئی میدان کلکتہ

سب جلد تر شریک صلوٰۃ و فلاح ہوں
سُن لی ہے اب ہر ایک نے آذان کلکتہ

احسان کی جزا نہیں احسان کے سوا
اُترے گا سر کے ساتھ ہی احسان کلکتہ

ہم سنّتِ خلیل کے پابند ہوں تو کیوں
پھوٹے نہ آگ ہی میں گلستان کلکتہ

تقلیدِ اہلبیت کریں ہم تو کیا عجب
میدانِ کربلا ہے میدانِ کلکتہ

سر در خلد ہیں ہیں شہیدان کا نور
ہوں گے شریک بزمِ شہیدانِ کلکتہ

شبلی سا شخص نوحہ گر کانپور تھا
لاریب آج تھا وہی شایان کلکتہ
دنیا سے اٹھ گیا مگر اب امتیاز شعر
جوہر سا شخص اور ہو ثنا خوان کلکتہ
لیکن ہے اک خفیف سی نسبت سے کچھ امید
میں بھی کبھی تھا ایک مسلمان کلکتہ
آغاز کلکتہ تو میسر ہوا صفدر
یارب کہیں نصیب ہو پایان کلکتہ

(حیدر آباد ۲۳ر دسمبر ۱۹۱۸ء)

فغانِ دہلی

(واقعات ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء)

کلمۂ حق ہے اگر وردِ زبانِ دہلی
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ دہلی

لب پہ آئے نہ کبھی شکوۂ جورِ اغیار
ہو زمانے سے الگ طرزِ فغانِ دہلی

للّٰہ الحمد کشادہ ہے رہِ صبر و صلوٰۃ
ہو کے بے خوف بڑھیں راہ روانِ دہلی

سر فروشی کے لئے پیر و جواں ہیں تیار
آج رونق پہ ہے کس درجہ دکانِ دہلی

سنگریزوں سے زیادہ نہیں گولی چھرے
یوں رکے گا نہ کبھی سیلِ رَوانِ دہلی

حق کے آتے ہی ہوا کعبہ سے باطل رخصت
چند دن اور رہیں دہلی میں بتانِ دہلی

ن لاکھ روکا نہ رُکا

(چھندواڑہ اپریل ۱۹۱۹ء)

نوحہ

نوحۂ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسینؑ
حق ہے شاہد کہ شہادت ہی تھی شایانِ حسینؑ

آج ہے اُمّتِ احمدؐ کے لئے فخر کا دن
آج کے روز ہوئی فتح نمایانِ حسینؑ

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسانِ حسینؑ

جو اُفق پر نظر آتا ہے محرم کا ہلال
ہے ہمارے لئے وہ مہرِ درخشانِ حسینؑ

کربلا تب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ
دین ہے اُمّی و عالم کا اب ایمانِ حسینؑ

شکر حق ہے کہ ابھی حق کی حمایت کے لئے
جان دینے کو ہیں موجود غلامانِ حسینؑ

ان سے پوچھو کہ جنھیں جان ہو ایماں سے عزیز
کم تھی کس جان سے بتلاؤ تمھیں جانِ حسینؑ

اس کو سینچا ہے شہیدوں نے لہو سے اپنے
سبز و شاداب نہ پھر کیوں ہو گلستانِ حسینؑ

یاں نہ گلچیں کی رسائی نہ خزاں کا ہے گزر
غم سے واقف ہی نہیں بلبلِ بستانِ حسینؑ

تب سے جاری ہے یہاں صبر و رضا کا لنگر
دل حاسد کی طرح تنگ نہیں خوانِ حسینؑ

دولت ایثار کی لٹتی ہے یہاں صدیوں سے
ختم ہوتا ہی نہیں گنج فراوانِ حسینؑ

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعانِ حسینؑ

نہیں میدان عمل تنگ مسلماں کے لئے
ہے یہی گوئے حسینؑ اور یہی میدانِ حسینؑ

ان کی تقلید کے دعوے کی کسے جرأت ہے؟
کہہ سکے کون کہ ہیں ہم بھی مریدانِ حسینؑ

نام میں اُن کے آب و جد سے ہی نسبت تو ضرور
اور دل سے بھی ہی ہر وقت ثنا خوانِ حسینؑ
گر شہادت کہیں، جوہر تجھے مل جائے تو پھر
رہے کوثر پہ بھی وابستۂ دامانِ حسینؑ

دُعائے اسیر

(اپنی عزیز بیٹی آمنہ[1] کی علالت پر جس کی اطلاع جیلخانہ میں ملی تھی)

میں ہوں مجبور، پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

اُس کی رحمت سے جو مایوس ہو وہ کافر ہے
ہم توکّل سے کسی وقت بھی معذور نہیں

امتحاں سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں؟

صبر بھی شیوۂ مسلم ہے مگر شکرِ خدا
نورِ اسلام سے دل آج بھی بے نور نہیں

---

(۱) مولانا کے لڑکا کوئی نہ تھا۔ چار لڑکیاں تھیں، ان میں یہ منجھلی صاحبزادی آمنہ مرحومہ عزیز ترین تھیں شادی کے کچھ عرصہ کے بعد شروع سنہ ۲۳ء میں دق میں مبتلا ہوئیں مولانا کو بیجاپور جیل میں اطلاع ہوئی

ہے دعا اور دوا فرض، ولے حکم خدا
ٹل سکے، یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ، نہ گلہ
اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں
اب دعا لب پہ بھی جاری ہو اگرچہ اس سے
یوں بھی حالِ دلِ مضطر کبھی مستور نہیں

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے، قرآں میں کیا
تُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیِّتِ مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا، تیری رحمت سے نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
باپ کے دل کو تو یوسف کی طرح ہے وہ عزیز
نہ سہی حسن میں گر خلق میں مشہور نہیں

یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل
میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں

مرہم زخم جگر آج بھی ہے صبر جمیل
حزنِ فرقت سے مگر آنکھ میں اب نور نہیں

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں؟

شانِ رحمت مجھے دکھلا، کہ ہو تسکیں کا نزول
دل جو مضطر ہے یہ، یارب، جبل طور نہیں

زائرِ مدینہ[1]

سب سمجھتے ہیں کہ تو شاد ہے مسرور ہے آج
کون کہتا ہے دلا تو دل رنجور ہے آج
کلفتِ قطع منازل ہوئی کافور ہے آج
ہر مدینہ سے جو نزدیک تو سب دور ہے آج
اپنے پلّے کوئی سوغات نہیں اس کے سوا
نقدِ جاں نذر کرے دل یہی دستور ہے آج
سنگِ در تک تو بہر کیف رسائی بخشی
دیکھوں کیا کیا مرے سرکار کو منظور ہے آج
آرزو ہائے دو عالم تھیں اور اک دل کل تک
فقط اک تیری تمنا سے وہ معمور ہے آج

---

(۱) یہ وہ منظوم تاثرات ہیں جو مولانا نے مدینہ منورہ جاتے وقت آخری منزل میں کہے تھے اور جنھیں وہ آبیار علی میں چلتے ہوئے ایک خاص حالت شوق میں پڑھتے جاتے تھے۔

رقصِ بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجئے
حسن مسئول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج

عشق خود بدعت و سرمایۂ صد بدعت ہے
رحم کر رحم۔ کہ عاشق ترا معذور ہے آج

اب بھی دیدار سے محروم ہی رکھے گا ہمیں
تھی جو اک حسرت پابوس بدستور ہے آج

بچ گیا بھی جو انالحق سے تو انت الحق ہے
میرے نعرے میں بھی کچھ مستیٔ منصور ہے آج

لن ترانی کی یہاں بھی وہی آتی ہے صدا
بے گماں قبۂ خضریٰ شجر طور ہے آج

چھوڑ فقہی کے لئے مسئلۂ موت و حیات
ایک جلوہ ہی عیاں تھا کبھی مستور ہے آج

جس سے چہرے و تک اٹھے تھے کبھی تیرہ بکے
دیکھو جوہر کی بھی آنکھوں میں وہی نور ہے آج

غزلیات
نمونۂ کلام ابتدائی

(۱)

زمانۂ طالب علمی در علیگڑھ کالج ۱۸۹۶ء

کیوں مے پرست دیکھ کے مدہوش ہو گئے
شیشے میں مے بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش
تھی رات پاس اور دل ناصبور تھا

کیوں تاب دید حضرت موسیٰ نہ لا سکے
کیا پہلوئے عدو کی طرح کوہ طور تھا

خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ سر کبھی
اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

ایضاً ۱۸۹۶ء

مجھے انکارِ وصلِ غیر پہ کیوں کر نہ رشک آئے
زباں کچھ اور بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

ذرا دم لے صبا، پھر سیرِ گل دل کھول کر کرنا
ابھی یہ عندلیبِ کم سخن کچھ اور کہتی ہے

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربعِ مسکوں کو
مگر اے ہم نفس، دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

تری خاطر بھی ہے مدِ نظر، پاسِ عدو بھی ہے
مگر، میں کیا کروں، دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے

حرم میں کر تو نے اظہار ترک مے کشی جو حسرؔ
مگر کمبخت کی بوئے دہن کچھ اور کہتی ہے

(۳)

رائے بریلی اپریل ۱۸۹۸ء

غیر کا خط ہے کہ دل ہے کسی دلدادہ کا
کچھ تو ہے تم نے جو مٹھی میں چھپا رکھا ہے
یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے

آپ آئے ہیں عیادت کو دم نزع عبث
جو ہر خستہ میں اب کہئے تو کیا رکھا ہے

(۴)

دیگر رائے بریلی اپریل ۱۸۹۸ء بعد امتحان بی۔ اے

کیا دل نے نکل کر خود ہی استقبال پیکاں کا
تو اضع شرط ہے رتبہ یہی کہتا تھا مہماں کا

ارادہ ہے طوافِ کعبہ کا اُس آفتِ جاں کا
خدا حافظ مسلمانو! تمھارے دین و ایماں کا

اُسی کے منتظر ہیں ہم بھی جس کی تو ہے اے بلبل
بہار آنے پہ ہوگا فیصلہ دست و گریباں کا

نکالا میرے پر دل میں رکھا دست وحشت نے
خدا کی شان ہے رتبہ ہو یہ خارِ مغیلاں کا

نہیں معلوم آئی تھی حیا کمبخت کو کس سے
کہ حسرت نے مرے دامانِ دل میں آکے منہ ڈھانکا

صدائے آفریں سے تیری آنسو پُچھ گئے دل کے
مگر پوچھا نہ تونے حال کچھ بھی چشمِ گریاں کا

ابھی تک خیر ہے لیکن بہار آنے دے اے بلبل
بلا لائے گا تیرے سر پہ ہر غنچہ گلستاں کا

یہ کیا آئے ہوئے بیٹھے ہیں بالیں پر عیادت کو
اجل کو فکر ہے مجھ سے زیادہ میرے درماں کا

جنوں باقی ہے ابتک گو تری محفل میں بیٹھا ہے
کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

غزلیات
ردیف وار

ردیف الف

(۱)

چند روزہ عیش ہے یہ جنت شداد کا
اس طرح ہرگز نہ ہوگا فیصلہ بغداد کا [۱]

شور ماتم کے لیے تیار رکھ گوش مراد
ہے شرار خس یہ ہنگامہ مبارکباد کا

پہلے بھی اکثر وہ نکلا مستحق شکر حق
جس کو ہم سمجھے تھے موقع شکوۂ فریاد کا

نور حق وہ شمع انور ہے جو بجھ سکتی نہیں
ہے خدا حافظ چراغ رہ گزار باد کا

عزم عاشق ہے خود اپنی کامیابی کی دلیل
نام بھی لینا نہ ہرگز کوشش برباد کا

ہم تو سمجھے تھے کہ ہوں گے اور بھی ظلم و ستم
حوصلہ کچھ بھی نہ نکلا آپ کی بیداد کا

اس پہ کیا موقوف ہے کر اور بھی ظلم و ستم
کچھ بھی باقی ہو جو ظالم حوصلہ بیداد کا

کر دیا قید قفس سے ہم کو آزاد چمن
پاس کافی ہو چکا اب خاطر صیاد کا

حکم کے آگے ترے پہلے بھی اٹھ سکتا نہ تھا
بار احساں اور سر پہ ہو گیا جلاد کا

دعوت مژگاں کی بھی جب ہمت باقی ہو کسے
ایسے دیوانے کے گھر کیا کام ہے فصاد کا

---

(۱) ۱۹۱۷ء میں جب پہلی بار یہ خبر آئی ہے کہ انگریزی فوجوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا، اُس وقت تک بغداد ترکوں کی حکومت میں تھا۔

گیارھویں کو فاتحہ دلوادیا کرتے ہیں ہم — ہے اثر اتنا ہی یادِ خفتۂ بغداد کا

آجتک ہے ایک کنعانی سے شہرت مصر کی — فیض سے حسرت[1] کے ہوگا نام فیض آباد کا

ہوگئے جوہر یہ کیسے بندۂ دامِ فریب

شور سنتے تھے بہت ہم حسرت[2] و آزاد[3] کا

(۴)

ہم اُس کی راہ میں مرنے کی دیکھتے رہے راہ

ذرا سا کام تھا، وہ بھی اجل سے ہو نہ سکا

کرائے معصیتِ رب میں طاعتِ مخلوق

تری جفا سے، ہماری وفا سے ہو نہ سکا

پیامِ مرگ ہے پیغامِ یار و مژدۂ وصل

وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے ہو نہ سکا

---

(۱) حسرت موہانی اُس وقت فیض آباد جیل میں قید تھے۔

(۲) مولانا حسرت موہانی

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد

(۳)

یہ فقط دو چار دن کی بات ہے　　　　پھر وہی تو ہے، وہی صحبت لا

(۴)

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھیے کب ہو خاتمہ اس قید بے میعاد کا

(۵)

محرم ۱۳۴۱ھ، اگست ۱۹۲۲ء

بیتاب کر رہی ہے تمنائے کربلا	یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا
ہے مقتل حسینؑ کی اب تک وہی بہار	ہیں کس قدر شگفتہ یہ گلہائے کربلا
اس باغ میں خزاں کا نہ ہوگا گزر کبھی	کیا رنگ دیکھیے ابھی دکھلائے کربلا
بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی	ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا
روز ازل سے ہے یہی اک مقصد حیات	جائیگا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا
جو راز کیمیا ہے نہاں خاک میں اسے	سمجھا ہے خوب ناصیہ فرسائے کربلا
مطلب فرات سے ہے نہ آب حیات سے	ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا
کوثر کے انتظار میں ہیں کب سے تشنہ کام	مجھ پر بھی اک نظر شہ والائے کربلا

کرنے کو یوں ہزار کریں سینہ کوبیاں　　　ہر چند ہی کے واسطے دُنیائے کربلا
جو بہرِ مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے ملجائے کربلا

(۶)

جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ جنوری ۱۹۲۳ء

فرق باقی گر کسی کے جیب اور دامن میں تھا
وہ جنونِ نارسا کا عکس پیراہن میں تھا

بھر دیا فیضِ جنوں نے اُس کا دامانِ مراد
فرق باقی کچھ نہ جس کے جیب اور دامن میں تھا

تیری کوتاہی ہے اے دستِ جنوں زنّار ساز
یہ بھی کیوں اک تار باقی میرے پیرہن میں تھا

کرکے چھوڑا، اے جنونِ نارسا، زنّار دار!
کیا یہی اک تار پہلے میرے پیراہن میں تھا؟

دست وحشت سے شکایت پاؤں کے چھالوں کو ہے
دل میں کھٹکا جاکے ہر وہ خار جو دامن میں تھا

جورِ گلچیں یاد رکھ، قیدِ قفس کا غم نہ کر،
چین کب اے بلبلِ نالاں تجھے گلشن میں تھا

زادِ تقویٰ تھا متاعِ کارواں جس وقت تک
قافلہ لٹنے کا ڈر اُلٹا دلِ رہزن میں تھا

یاد آتا ہے جراحت میں بھی لطفِ خستگی
تیرے پیکاں کا مزا کچھ کچھ سرِ سوزن میں تھا

رزق تیرا خود تجھے مل جائے گا تو غم نہ کر
وہ تو رزقِ برق ہی تھا جو ترے خرمن میں تھا

عشق میں تاب و تواں ہیں اور بھی تکلیف دہ
درد ہو کر رہ گیا جو زور میرے تن میں تھا

دل جلی تو تھی ہی جل اُٹھیں قفس کی تیلیاں
رات دیپک کا اثر بلبل ترے شیون میں تھا

اُس کا کعبہ جس کی جانب روز پڑھتے تھے نماز
کیا کہیں گے اُس سے کیونکر قبضۂ دشمن میں تھا؟

تجھ سے دردِ ہجر کہتا کون، کس کی تھی مجال؟
فتنۂ صد حشر خوابیدہ تری چتون میں تھا

قاتلِ جوہر کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا حشر تک
کس بلا کا خون ظالم کی رگِ گردن میں تھا

(۵)

شعبان المبارک ۱۳۴۱ھ ، اپریل ۱۹۲۳ء

ہے یہاں نام عشق کا لینا — اپنے پیچھے بلا لگا لینا
شرطِ تحریر ہے پہلے سن لے پھر — خامے کو ہاتھ میں ڈالینا
نامۂ شوق اُن کو شوق سے لکھ — ق — غیر کو بھی مگر دکھا لینا
کل کو بوسے کے واسطے بھی ضرور — شرط ہو گی اُسے جتا لینا
اگر آئے طبیبِ مرگ کہیں — دوستو! ہم کو بھی بلا لینا
ہے جو مومن تو بھول کر بھی دلا! — نہ کبھی نام ما سوا لینا
دعویٰ توحید کا تو کرتا ہے — نفس کو مت خدا بنا لینا
ہم پھریں تجھ سے یہ نہ ہو یارا! — اس سے پہلے ہمیں اٹھا لینا
تم کو روزِ جزا کا کیا ڈر ہے — داورِ حشر کو بلا لینا!
ورنہ ہے یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل — شاہدوں کو سکھا پڑھا لینا
ہو اِدھر بھی کبھی نگاہِ کرم — ہم غریبوں کی بھی دعا لینا

زلف رہنے دو، ہاں نقاب ذرا — رُخِ محبوب سے ہٹا لینا

آج جی بھر کے دیکھ لینے دو — کل کو دل کھول کر ستا لینا

اس بگڑنے کی کیا سند اے دل؟ — شام تک پھر اُنھیں بلا لینا

وصل کی شب نہ چھیڑ قصۂ ہجر — یہ کسی اور دن سُنا لینا

زہر ہی ہو مگر وہ دیں تو کہیں؟ — مجھ کو لگتا ہے کیا بُرا لینا

اُن کے در سے زکوٰۃِ حسن اگر — گالیاں بھی ملیں تو کھا لینا

ساقیا دیکھ تشنہ کام نہ جائیں — ذبح سے پہلے کچھ پلا لینا

غیر سے دوستی کرو، لیکن — پہلے کچھ روز آزما لینا

طالبِ خلد، مردِ عشق بھی اب — ہو گیا ہے تجھے ردا لینا

ایک ہی جام اور یہ سرمستی — ساقیا، دیکھ! میں چلا، لینا

تم کو زیبا نہ تھا وداع کے وقت
آنکھ جوہر سے یوں چُرا لینا

(۸)

رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ، اپریل ۱۹۲۲ء

تجھے تسکینِ دل پایا، تجھے آرامِ جاں پایا
جہاں بھی ہو تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈھا وہاں پایا

ہمیں ہر چیز میں آئی نظر، یارب ادا تیری
وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجھ کو بے نشاں پایا

کوئی نامہرباں ہو کر ہمارا کیا بگاڑے گا
کرم تو تیرا ہے ہم پر، تجھے تو مہرباں پایا

ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے
اسی کو سرخرو دیکھا، اسی کو کامراں پایا

عنادل ہیں چمن کی تیرے فصلِ گل سے بے پروا
محبت کو تری ہم نے بہارِ بے خزاں پایا

حرم میں تھا ہر اک کو یوں تو تیرے عشق کا دعوےٰ
جو کی تحقیق تو اکثر وہی عشقِ بتاں پایا

ہماری جان بھی حاضر ہے اُس کے اک اشارہ پر
کہ جس کو اک جہاں نے آپ ہی جانِ جہاں پایا

کسی کو ڈھونڈھتا دیکھو خود اپنے گوشۂ دل میں
تو بس سمجھو کہ اب اُس نے سُراغِ لامکاں پایا

رہا آوارۂ دیر و حرم پہلو سے بیگانہ
دل اُس کا عرش و کرسی ہی کہاں ڈھونڈا کہاں پایا

تجلّی خود خجلت تر دامنی سے ہو گئے عاصی
تری رحمت کو جب دیکھا تو بحرِ بیکراں پایا
جہاں ایماں ہو واں کیسے گزر ہو یاس و حرماں کا
کسی مومن کو بھی اے دل، خدا سے بدگماں پایا
نہیں سرکش کی سرکوبی میں وہ محتاج قوت کا
اسی کو چن لیا جس کو ضعیف و ناتواں پایا
وہ ساقی جس نے تلچھٹ تک نہ رکھی فکر فردا میں
اُسے کوثر پہ ہم نے قبلہ گاہِ مے کشاں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جو حشر کا پڑا تا ہے
کہ ہاں نام محمدؐ مرتے دم وردِ زباں پایا

(۹)

سرورِ کیف لاتحزن کو بشرے سے عیاں پایا
اسیرِ قیدِ تنہائی کو مست و شادماں پایا
طواف کعبہ بھی کر آئے شوقِ حور و غلماں میں
جب آخر دار کو دیکھا درِ باغِ جناں پایا

کرو برباد تنکے شوق سے اس آشیانے کے
کہ ہم نے شاخِ طوبیٰ پر نیا اک آشیاں پایا
دلا! خوش ہو نشانہ ہے اگر تو جور بے جا کا
یہ کیا کم ہے کہ تجھ کو مستحقِ امتحاں پایا
حیاتِ جاوداں کیا خاک ملتی مر کے زاہد کو
اُسے تو موت سے پہلے ہی رشتِ استخواں پایا
خیالِ خلد نے آوارہ رکھا مدتوں ہم کو
وہ چھوڑا اب کہیں جا کر درِ پیرِ مغاں پایا
نہ بھائی ہوگی یہ تمکیں، یہ وضعِ احتیاط اس کو
اگر ساقی کو رندو! تم نے کچھ کچھ سرگراں پایا
ہوا تھا قید فصلِ گل میں جو مرغ اُس کو گلشن میں
قفس سے چھٹتے ہی صیدِ غمِ جورِ خزاں پایا
بگڑ جائے گی تیری ہم سے، سن لے صاف کہتے ہیں
گر اب کے ہم نے اے دل تجھ کو سرگرمِ فغاں پایا
میاں[1] بھائی بھی بھیا[1] بھی سدھارے ماہِ رمضاں میں
نصیبِ ہر رواں دیکھو کہ ایسا کارواں پایا

(۱) والد مرحوم اور خسر مرحوم کی طرف اشارہ ہے۔

ہماری سب کی آبادی ہے تیرے دم سے آبادی[1]
بڑھاپے میں بھی ہم نے تیری ہمت کو جواں پایا
جو ہر حالت میں صبر و شکر ہوں اسلام کے معنی
تو تجھکو عالموں سے بڑھ کے اُس کا رازداں پایا
زمانے کے جو گرم و سرد سے ہو جائے بے پروا
تو اُس کی یاں بھی جنت ہے کہ عیش جاوداں پایا
بصد حرماں اُٹھے بالیں سے سب خواہان و راحت کے
جسے وہ نیمجاں سمجھے تھے اُس کو سخت جاں پایا
کبھی جوہر کے پہلو میں بھی اک آتش فشاں دل تھا
پر اب کی بار جو دیکھا تو یوں ہی سا دھواں پایا

(۱۰)

رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ ، مئی ۱۹۲۳ء

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گرانباری کا
تیری رحمت ہے سبب میری سبکساری کا

---

(۱) اپنی والدہ ماجدہ بی اماں (مرحومہ) کی طرف اشارہ ہے۔

دار نے اک سگِ دنیا کو یہ بخشا ہے عروج
ہے فرشتوں میں بھی چرچا مری دینداری کا

دل و جاں سونپ چکے ہم تجھے اے جانِ جہاں
اب ہمیں خوف ہی کیا اپنی گرفتاری کا؟

جان بھی چیز ہے کوئی کہ رکھیں تم سے دریغ؟
پاس اتنا بھی نہ ہو رسمِ وفاداری کا

چیز ہی ایسی وہ کیا ہے کہ رکھیں جان دریغ؟
کیا اب اتنا بھی نہ ہو پاس وفاداری کا

ساقیا سب کو تری ایک نظر تھی کافی
تھا کسے ہوش ترے عہد میں ہشیاری کا

میں فدا، آج بھی ہو جائے وہی ایک نگاہ
خاتمہ ہو کہیں اس دور کی خودداری کا

تجھ کو کیا فکر ہے؟ کافی ہے تجھے صبر و صلوٰۃ
حل یہ ہر حال میں اے دل! یہی دشواری کا

عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے غافل!
تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہے بیکاری کا!

عاشقوں کے لئے ہے دارہی داروئے شفا
عشق کی طب میں دوا نام ہے بیماری کا
اجل استادہ ہے بالیں پہ، مریضِ غمِ عشق!
آنکھ تو کھول ذرا وقت ہے بیداری کا
جوہر اور حاجب و درماں کی خوشامد کیا خوب!
عرش و کرسی پہ گزر ہے ترے درباری کا

(۱۱)

مل چکا تجھ سے صلہ ہم کو وفاداری کا
تجھ کو آیا نہ سلیقہ کبھی دل داری کا
طفلِ مکتب ہی ترے سامنے خود چرخِ کہن
کس سے سیکھا ہے یہ اندازِ دل آزاری کا
عقل والا کوئی بچتا نہیں پھندے سے ترے
گو بہت عام ہے شہرہ تری عیاری کا
ہم کو خود شوقِ شہادت ہے، گواہی کیسی؟
فیصلہ کر بھی چکو مجرمِ اقراری کا

میری شہرت بھی اگر ہوگی تو کیا ؟ قتل بھی کر
نام ہو جائے گا تیری بھی ستم گاری کا

کیا قباحت ہو مرے قتل سے شہرت ہی سہی
نام ہوگا نہ بھلا تیرے ستم گاری کا

قاتل اب دیر ہے کیا ؟ جام شہادت دے چکے
ہوگیا وقت کبھی کا ، مری افطاری کا

تو جو آمادہ جو، اے دل تو ہی پھر دار بھی ہے ، سیج !
آزما دیکھ ، یہ سب کھیل ہے تیاری کا !

سب ہیں فانی ، غم دنیا نہ رہا ، ہم نہ رہے
رہ گیا نام غم عشق کی غم خواری کا

تو تو ہم سب کو یہیں چھوڑ چلا اسے جوہر
شور سنتے تھے بہت تیری وفاداری کا

(۱۲)

ہوگیا حال یہ کیا ہائے ! وفاداری کا
کوئی پرسان نہیں اس دور میں بیچاری کا

یاد آتا نہیں بھولے سے جنھیں عہد الست
ہم پہ الزام وہی دھرتے ہیں غدّاری کا

ہوئی تقصیر کہ بھولے نہیں ہم عہد الست
ہے بجا ہم پہ گر الزام ہو غدّاری کا

جرم سنگیں ہو خدا ہی ہے جو ہو جائے نجات!
"ہم پہ الزام ہے مذہب کی طرفداری کا"

حاکم وقت ہے دنیا کا ہر ادنیٰ سا غلام
زعم ہے مورو مگس کو بھی عملداری کا

سرفروشی کے لئے ہم تو ہیں آمادہ مگر
حوصلہ بھی تو کسی میں ہو خریداری کا

سب کی ہو کر نہ ہوئی ایک کی تو، اے دُنیا
کون گرویدہ ہو تجھ سی زنِ بازاری کا

جوہر افسوس کہ زنداں میں بھی چکی نہ ملی
قید ہو کر بھی ہوں محتاج بیخ بہاری کا

ردیف ت

(۱)

ذیقعد سنہ ۱۳۴۰ھ، جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

ہم معنی ہوس نہیں، اے دل ہوائے دوست
راضی ہوں بس اسی میں ہو جس میں رضائے دوست

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست
اُسکے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

یاں جنبشِ مژہ بھی گناہ عظیم ہے
چپ چاپ دیکھتے رہو جو کچھ دکھائے دوست

ملتی نہیں کسی کو سند امتحاں بغیر
دار و رسن کے حکم کو سمجھو صلائے دوست

یعقوب پہ فضول ہوئے لوگ خندہ زن
یاں لامکاں سے آتی ہے بوئے قبائے دوست

کیا کم تھا ہجرِ یار ہی، پھر اُس پہ رشکِ غیر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے مبتلائے دوست

ہے روح بھی نثار، بدن بھی نثارِ یار
دل بھی فدائے دوست، جگر بھی فدائے دوست

جوہر وہ صبر آپ ہی دے گا، اگر نہیں
ہے اعتبار وعدۂ صبر آزمائے دوست

(۲)

چھپتی ہے کب چھپائے سے جوہر ادائے دوست
دشمن کی دشمنی ہے فقط ابتلائے دوست

دینا تھی دادِ تشنہ لبی یوں حسینؑ کو
کوثر کا اک بہانہ بنی کربلائے دوست

کیا جائیں کوئے یار میں یوں اذنِ غیر سے
ہے انتظار، دیکھئے کب تک بلائے دوست

اُس نغمۂ الست کی کچھ دلکشی نہ پوچھ
کانوں میں آرہی ہے ابھی تک صدائے دوست

چھپتا نہ بزمِ غیر میں بھی رازِ دل مگر
دشمن کے آگے کون کہے ماجرائے دوست

دیر و حرم میں کرتے ہو کس کی جستجو؟
حیرت کی جا ہے دوستو ہے دل میں جائے دوست

اِک ہم ہیں خاکِ پا بھی میسر نہیں جنہیں
یا ایک تھے بصیری کہ پائی ردائے دوست

جائز ہے وصل و ہجر کا کب امتیاز یاں
جو ہر جفائے غیر کو سمجھو وفائے دوست

(۴۳)

محرم الحرام سنہ ۱۳۴۱ھ، اگست سنہ ۱۹۲۲ء

ہرگز نہ ہو، اے دل غمِ جاناں کی شکایت
کرتا ہے بھلا کوئی بھی مہماں کی شکایت

آزاد تھے کب قیدِ غمِ عشق سے؟ ہم کو
زنجیر کا شکوہ ہے، نہ زنداں کی شکایت

وہ یہ نہ کہیں گے کہ تمھیں موت نہ آئی؟
کس منہ سے کریں ہم شبِ ہجراں کی شکایت

مشکور جنوں آپ ہیں وحشی ترے، ان کو
محمل کا گلہ ہے، نہ بیاباں کی شکایت

گو صبر قیامت کا ہے درکار ہی اے دل!
یاں کفر ہے اُس دشمنِ ایماں کی شکایت

جی چاہے جہاں بھیج! ہمیں تجھ سے غرض ہی
مالک کا نہ کچھ شکر، نہ رضواں کی شکایت

شرمندہ کفن نے کیا اس درجہ کہ تا حشر
اب جیب کا شکوہ ہی، نہ داماں کی شکایت

تھا اُن کے تصور میں بھی اک وصل کا عالم
ہو سکتی ہی پھر کیا شبِ ہجراں کی شکایت؟

کیوں فکر ہو؟ کیا اپنے کبھی دن نہ پھریں گے
بے کار ہے پھر گردشِ دوراں کی شکایت

لڑتا ہے ہوا سے بھی کوئی لاکھ خفا ہو؟
بیجا ہے تری زلفِ پریشاں کی شکایت

ہیں عشق کے بیمار بھی دنیا سے نرالے
ہے درد کے بدلے انھیں درماں کی شکایت

اُن سے نہ ستم کا نہ تغافل کا گلہ ہے
ہوجاتی ہے ہاں! پاکیٔ داماں کی شکایت

منظور نہیں جب انھیں خود جلوہ دکھانا
کیوں کیجئے پھر حاجب و درباں کی شکایت

تھا نذر ازل ہی سے دل اس جانِ جہاں کی
کرتے رہو یوں ابرو و مژگاں کی شکایت

جہاں دل جو ہر کا بلا اذن سدھارا
پیکاں تو گیا رہ گئی پیکاں کی شکایت

ردیف د

(۱)

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اِک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ھل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد
ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد
ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

(۳)

تمہارے فضل کے ہو کے یقین رکھتے ہیں
کہ عید آئے گی بے شک مہِ صیام کے بعد
ستم سے کچھ نہ ہوا، اب کھلا ستم گر پر
ابھی کچھ اور بھی باقی ہے قتلِ عام کے بعد
زمیں سے چھٹ گئے جبرئیل بھی قیامت تک
کہ وحی بند ہوئی سیدالانام کے بعد
تمہیں کرو سرِ تسلیم پہلے خم بہرِ قتل
کہ سر جھکاتے ہیں سب مقتدی امام کے بعد

ردیف ر

(۱)

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

خوکردۂ ازل سے تجلیِ طور کے
جھپکے گی آنکھ کیا تری تلوار دیکھ کر

آساں پسندیوں سے ہیں بیزار اہلِ عشق
چھانٹا یہ مرحلہ بھی ہے دشوار دیکھ کر

بن جائے گا یہ رشتۂ تسبیح ایک دن
دھوکا نہ کھائیو کہیں زنار دیکھ کر

اس شانِ امتیاز کو دیکھو کہ اہلِ کفر
مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر

ز ہم رشتگیِ اہلِ وطن کا نشاں ہے یہ ۔

جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جاں
لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر

تیرِ نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ
باہم دل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر

یہ کیا کہ سجدہ گاہ ہے ہر سنگِ آستاں
گھِسنا جبیں کو خانۂ خمار دیکھ کر

کچھ بھی تو ضبطِ گریہ نہ شبنم سے ہو سکا
بلبل کو فصلِ گل میں گرفتار دیکھ کر

ہم خاصگانِ اہلِ نظر اور یہ قتلِ عام
جور و ستم بھی کر تو ستمگار دیکھ کر

ہر سینہ آج ہی ترے پیکاں کا منتظر
ہوا انتخاب اے نگہِ یار، دیکھ کر

(۲)

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

مستِ مئے الست کہاں اور ہوس کہاں
طرزِ وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور

گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے
صیاد لاکے رکھے قفس کو چمن سے دور

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا
روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور

تقویٰ کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دور

واعظ کا ارتداد نہ میرا ہے ترکِ کفر
کچھ بھی نہیں ہے ساقی تو بہ شکن سے دور

پاداشِ جرمِ عشق سے کب تک مفر بھلا
مانا کہ تم رہا کئے دار و رسن سے دور

ہے یہ نصیب کربلا سے بھی قرب یثرب بھی
اور چاہتے ہیں یہ کہ نہ ہوں پنجتن سے دور

یوں بچ سکو ہوا خندۂ حشر سے تو ہاں
مارو دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور

آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

مسلم اجل سے دور نہیں روز کربلا
رہتا نہیں برات میں دولھا دلہن سے دور

منقار عندلیب کو صیّاد سی چکا
مانا کہ گوش گل ہے لب نالہ زن سے دور

اللہ رے نور چشم محبت کی جستجو
نکلا اسیر مصر نہ کچھ بھی وطن سے دور

ہم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردش چرخ کہن سے دور

مفتیٔ مفت خوار کو سب کچھ حلال ہے
بوئے شراب شرک ہو پھر کیوں دہن سے دور

دست دراز کو ترے اے رند باصفا
رکھے خدا عمامۂ شیخ زمن سے دور

تاویل بڑھ کے اقربُ للکفر ہو گئی
کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم وفن سے دور

ہیں اتنے لاف و شوق پہ مرعوبِ حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور

تم تو ہو نذرِ عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ
یہ بات ہے مروّتِ اہلِ سخن سے دور

تم سے بعید تھا کہ بھلا دو اگرچہ ہم
اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرت جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

(سنہ ۱۹۱۲ء)

ردیف س

(۱)

لاکھ حربے سہی ہر وضع کے شیطان کے پاس
ڈھال ایمان کی موجود ہو انسان کے پاس

ملک سمجھو اسے یا مال، بجا ہے اک دین
آج تو بس اک یہی دولت ہے مسلمان کے پاس

لگتے ہی تیر تمہارا گئی یوں جان نکل
بیٹھ کر جاتی گھڑی دو گھڑی مہمان کے پاس

آدمیت ہے تو بنیاد ہے ہر خوبی کی
ہو نہ یہ بھی تو دھرا کیا ہے پھر انسان کے پاس

صحبت یار ہے اے دل تجھے گھر بیٹھے نصیب
پھر ترا کام ہے کیا حاجب و دربان کے پاس

خواہشیں نفس کی کرتے تو ہو پوری لیکن
اس سے بہتر نہیں آلہ کوئی شیطان کے پاس

ہم نے دل بھر کے کچھ اس طرح نکالے ارماں
کہ پھٹکتا نہیں دل جا کے اب ارمان کے پاس

مت سمجھنا انھیں کم مایہ، غنی ہیں یہ لوگ
کنز مخفی ہے ہر اک صاحب ایمان کے پاس

جبہ سائی کی بھی کچھ ہو گی یقیں کو امید
گالیاں کھاتے ہو جا جا کے جو دربان کے پاس

ردیف ک

(۱)

یوم الوداع رمضان سنہ ۱۳۴۱ھ ، مئی سنہ ۱۹۲۳ء

بس ساتھ تھا اس ماہِ رمضاں کا یہاں تک
اب دیکھئے جیتے بھی ہیں اگلے رمضاں تک

گو شرح پہ کھلا کیوں نہ ، اجل آج کا روزہ
پہنچا نہ دیا ہم کو درِ پیرِ مغاں تک

یکبارگی ہر قید سے ہو جائے رہائی
جا پہنچیں جو زنداں سے کہیں باغِ جناں تک

گھبرا کے لگا کہنے دِلا ، تو تو ابھی سے
"ہے صبر کی حد بھی کوئی ؟ ہو صبر کہاں تک"

یاں جنبشِ مژگاں بھی ہے ، اک جرم ، مگر ہے
مطلوب تجھے فرصتِ فریاد و فغاں تک

اقرا ہے یہی مکتبِ تسلیم و رضا کی
وہ سر بھی اڑا دیں تو ہلا نا نہ زباں تک

تو شوق سے کر ظلم، نہ ڈر قحطِ وفا سے
سستی ہے ترے واسطے یہ جنسِ گراں تک

اس بارگہِ حسن کو کیا اس سے سروکار؟
سرحدِ ہوس جاتی ہے بس عشقِ بتاں تک

جو سر ساسہ کا راور انجام شہادت!
اُس سے تو کسی کو بھی نہ تھا اس کا گماں تک

ردیف م

(۱)

جمادی الاول ۱۳۴۱ھ، دسمبر ۱۹۲۲ء

کیوں شہر چھوڑ جا چھپیں دہقانیوں میں ہم؟
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

آزاد بھی جبھی سے ہیں ہم، ہوشیار بھی
جب سے ہیں اے جنوں! ترے زندانیوں میں ہم

نادانیاں ہزار سہی، دوستو! مگر
دانا بھی ہو گئے انھیں نادانیوں میں ہم

کب شوقِ جامہ در سے ہے یوسف! یہاں مفر؟
دامانیوں میں تم ہو، گریبانیوں میں ہم

محروم گو حرم سے رہے، پر زہے نصیب!
داخل تو آج ہو گئے قربانیوں میں ہم

ہنگامے روز روز کے خوگر بنا گئے
اب خوش ہیں آئے دن کی پریشانیوں میں ہم

واقف نہ تھے کشش سے زلیخا کے عشق کی
یوسف کو ڈھونڈھتے رہے کنعانیوں میں ہم

نار جحیم سے نہیں کچھ کم ہے جب
محسوس کر رہے ہیں پشیمانیوں میں ہم

گر ہے تجھے متاع قفس اس قدر عزیز
صیاد خوش ہیں تیری نگہبانیوں میں ہم

پیچھا چھڑا لیں اور اک اس نفس سے تو پھر
فارغ ہوں خوب بے سروسامانیوں میں ہم

بنا بنا کے روز وصل کے نقشے بگڑ گئے
آباد پھر بھی ہیں انہیں ویرانیوں میں ہم

شوکت[۱] کا قول ہے وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

---

(۱) مولانا شوکت علی اس وقت راجکوٹ جیل میں مقید تھے اور خبر آئی تھی کہ بہت دبلے ہو گئے ہیں ۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کریں ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں[1] میں ہم

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دین یہی
گڈنی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم[2]

ہم زندہ دل ہیں زندہ جاوید، یا کہ خضر؟
بچوں سے اب بھی کم نہیں شیطانیوں میں ہم

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں؟
دار و رسن کے گرچہ نہ ہوں بانیوں میں ہم

---

(۱) علی گڑھ کا ایک مشہور خاندان
(۲) مسلمانوں میں یہ تحریک ہوئی تھی کہ ترکوں کی حمایت کے لئے ایک جیش انگورہ تیار ہو۔ ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے یہ تجویز پیش کی کہ یونانیوں کی حمایت میں ایک جیش تیار ہو۔ مولانا نے یہ شعر ایک وفادار خان بہادر کی زبان سے کہا ہے۔

ردیف ن

(۱)

کیا ڈھونڈھتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو
اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگِ چمن کہاں

کشتوں کو تیرے کس نے کیا ہے سپردِ خاک
ان میّتوں کے واسطے گور و کفن کہاں

سُنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی
اس دورِ اعتدال میں دار و رسن کہاں

سن لیجئے خلوتوں میں اناالحق کا اِدّعا
سولی پہ چڑھ سنائے وہ اب نعرہ زن کہاں

فرصت کسے خوشامدِ شمر و یزید سے
اب اِدّعائے پیروئ پنجتن کہاں

(۳)

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں؟

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ میں نے بھی سوغاتیں

شیطان کی چالوں سے اب ہو گئے سب واقف
اب ہوں گی الم نشرح ملعون کی سب گھاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جو ہیں اس دیس کی برساتیں

(آغاز سنہ ۲۲ء)

(۳)

مجھ سے یہ دیکھی نہیں جاتی تباہی کیا کروں ؟
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، الٰہی کیا کروں؟
اُس کی رحمت کو تو جو درکار ہے عذرِ گناہ
لیکے پھر زاہد کا عذرِ بے گناہی کیا کروں؟

ردیف و

(۱)

فصلِ گل کے متمنی تھے سبھی، پر اے چرخ
کیا ضروری تھا کہ اک مرغِ گرفتار بھی ہو

عشقِ مجنوں کے لئے ناقۂ لیلیٰ کے سوا
شرط یہ بھی ہے کہ اک وادیِ پُرخار بھی ہو

دست و پابستہ ہوں، سائل ہوں یدِ الٰہی کا
اس کی حاجت نہیں پھر ہاتھ میں تلوار بھی ہو

تشنہ کاموں سے ہی خود آج یہ ساقی کو گلہ
ہم تو دیں، پر کوئی اس مے کا طلبگار بھی ہو

یہ بھی کیا پیرویِ حق ہے کہ خاموش ہیں سب
ہاں اناالحق بھی ہو، منصور بھی ہو، دار بھی ہو

جاں فروشی کے لئے ہم تو ہیں تیار مگر
کوئی اس جنسِ گرامی کا خریدار بھی ہو

(چھتنداواڑہ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۸ء و مئی ۱۹۱۹ء)

(۲)

ساز بھی چاہیے کچھ اب نہ اتارو دمِ ذبح
رقصِ بسمل ہے تو زنجیر کی جھنکار بھی ہو

کم سمجھتے ہیں غلامی کو جو یہ سمجھے ہیں
بت پرستی کا نشاں دوش پہ زنّار بھی ہو

بت پرستی کا نشاں طوقِ غلامی کم ہے
کیا ضروری ہے کہ قشقہ بھی ہو زنّار بھی ہو

ہے آزاد جو رہتا ہو تمھیں کیا جو ہر
تم تو زندانیٔ الفت ہو، گرفتار بھی ہو

(۳)

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

پھر ہو رہا ہے شورِ صلائے نبردِ عشق
ہاں اے دہانِ زخم جوابِ الاَماں نہ ہو

بازارِ جاں فروش میں سودا نہ ہو یہ کیا
گاہک ملے تو جنس تو یہ بھی گراں نہ ہو

اس درد لا جواب کی کیوں کر کروں دوا
وہ حال دلنشیں بھی تو مجھ سے بیاں نہ ہو

کیا فائدہ گر اُس نے چھپایا بھی دردِ دل
یہ کام جب ہے کہ مژہ خونچکاں نہ ہو

کیا کیجیے چمن کے مائدہ دل کو لخت لخت
تیرا ہی تیر سینے میں جب میہماں نہ ہو

خوفِ رقیب کا تو یہ عالم اور اُس پہ عشق
سب چاہتے ہیں چاہ کا اُن پر گماں نہ ہو

ہے وصلِ یار کی بھی تمنا کا حوصلہ
ڈر یہ بھی ہے کہ طبعِ عدو پر گراں نہ ہو

پہلو سے دل کو لیکے وہ کہتے ہیں ناز سے
کیا آئیں گھر میں آپ ہی جب میزباں نہ ہو

سنتے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ن - سنتے ہی جس کے اُن کے بھی آنسو نکل پڑے -

(۴۴)

بے خوف غیر، دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

ہوں بے ہراس، یہ مجھے رکھیں کسی جگہ
ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو

اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں
اور یوں نہ ہو بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو

ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض
سب بدگماں ہوا کریں تو بدگماں نہ ہو

دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اُسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے
یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو

ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے
پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

سلنے تو پھر چلے ہو مشیخت پناہ سے
قشقہ کا دیکھو آج جبیں پر نشاں نہ ہو
جو ہر اس ایک دل کے لئے لتنے مشغلے
کی ہے خدا کی چاہ تو عشق بتاں نہ ہو

(۵)

شوال ۱۳۴۰ھ، جون ۱۹۲۲ء

رہے گی اُٹھ کے یہ اک دن نقاب دیکھو تو
ہمارے رب ہو ہمیں سے حجاب دیکھو تو
سمجھ رکھا ہے ہمیں ناتواں، پر اتنا بھی
ہے ذو انتقام شدید العقاب دیکھو تو
کرو نہ فکر، کہ یہ زندگی دو روزہ ہے
حلال ہو کے رہے گی شراب دیکھو تو
شفق کے آج تو تیور ہی کچھ نرالے ہیں
نہ ہو کسی کا رُخ پر عتاب دیکھو تو
تمھیں مواخذۂ حشر کا یقیں نہ سہی
مگر قریب ہے یوم الحساب دیکھو تو

بس آ چلی ہے شب وعدہ اب تو غم نہ کرو
ہوا ہے زرد رُخ آفتاب دیکھو تو

ہے قبلِ مرگ ہی اعدائے دیں کی واویلا
ابھی ہوا ہی کہاں ہے عذاب دیکھو تو

وہ دل کو گوشت کا ٹکڑا ہی جان کر سمجھیں
کہ جل نہ جائے کہیں یہ کباب دیکھو تو

تباہ گھر تو خدا کا کرو، یہ کس کس کو
کرے تباہ یہ خانہ خراب دیکھو تو

یہ کیا کہا کہ نہیں ستم سے بیکسوں کو مفر
کسی کے پاس ہے حسن المآب دیکھو تو

بہارِ خونِ شہادت دکھا گئے جوہر
خزاں میں اور یہ رنگِ شباب دیکھو تو

ردیف ہ

(۱)

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

وحشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو!
بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ

تو طیرا بابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بیچارگی پہ اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

ہم کہہ نہیں سکتے وہ کریں چارہ گری بھی
حالِ دلِ بیمار طبیبوں کو سنا دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پر شوخیٔ خونِ شہدا دیکھ
یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ۔ تو بھی بجھا دیکھ
سمجھا بھی ہے کچھ تو کہ یہ ہے کس سے تمرّد
اللہ کو مان، اپنی حقیقت کو ذرا دیکھ
ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ ستا دیکھ
ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب، پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ
خو تیری دو روزہ، مرا پیمان ہے ازل کا
پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ
عقبیٰ تو کہاں واں نہیں دنیا کا بھی کچھ ٹھیک
اس کافرِ بے فیض سے دل تو بھی لگا دیکھ
سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر زمانے کی ہوا دیکھ (۱۹۱۶ء)

(۲)

میرے[۱] لہو سے خاک وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سرگزشت
دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

(۳)

ہو کچھ بھی مگر شور سلاسل تو نہیں یہ
جو سر کا تڑپنا دم بسمل تو نہیں یہ
ہے بات تو جب شمع میں تمکیں ہے قائم
مقتل ہے دلا! رقص کی محفل تو نہیں یہ
معمور تقاضوں سے ہی شکووں سے ہے لبریز
جس دل پہ ہمیں ناز تھا وہ دل تو نہیں یہ
نالے کی غنیمت ہے اب اتنی بھی رسائی
وہ پوچھ رہے ہیں کوئی سائل تو نہیں یہ
ہوں تارک اسلام تو کیا فکر ہے اس کی
ایمان کی جانب کہیں مائل تو نہیں یہ؟
کچھ ترک محبت تو نہیں ضبط فغاں سے
ہم کرنے پہ آجائیں تو مشکل تو نہیں یہ

---

(۱) یہ دو اشعار جیل چھوڑتے وقت لکھے گئے تاکہ احباب کے لئے مختصر جواب کا کام دیں۔

آئی نہ ہو زنداں میں خبر موسمِ گل کی؟
سننا تو ذرا شورِ عنادل تو نہیں یہ

ہے وصل کی شب بھی تمھیں ل سؤسی پرخاش
پہلو میں پڑا رہنے دو حائل تو نہیں یہ

جا لگنے دے جودی پہ سفینہ کو نہ کر فکر
بیکار کی رٹ ہے کہیں ساحل تو نہیں یہ

ہاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

مجنوں ہے تو کیا عشق کا احساس بھی کھویا؟
جس میں تری لیلیٰ ہو وہ محمل تو نہیں یہ

ردیف ی

(۱)

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

عہدِ اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

جس نے ہنگامہ عدالت کا تری دیکھا ہے
اُس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو
سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی

بندگی میں تری سہتے ہی ہیں لاکھوں پیٹیں
چند دن کے لئے دوزخ کی ہوا اور سہی

دین و دل جا ہی چکا جان بھی جاتی ہے تو جائے
ترکشِ کفر میں ایک تیرِ قضا اور سہی

ربِّ عزت کے لئے بھی کوئی رہنے دو خطاب
"تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی"

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
مالک الملک پہ ایماں کی سزا اور سہی

ہم وفاکیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

(۴)

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھئے
کب درِ مے خانۂ کوثر کھلے

طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے

چاک کر سینہ کو پہلو چیر ڈال
یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے

رات تلچھٹ تک نہ چھوڑی تب کہیں
رازہائے بادہ و ساغر کھلے

لو وہ آ پہنچا جنوں کا قافلہ
پاؤں زخمی، خاک سر پہ سر کھلے

ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا
رازِ فتحِ سبطِ پیغمبر کھلے

رونمائی کے لئے لایا ہوں جاں
اب تو شاید چہرۂ انور سے کھلے

اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا
ناخدا کیا دیر ہے لنگر کھلے

یہ نظربندی تو نکلی ردِ سحر (۱)
دیدہ ہائے ہوش اب جاکر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

(۳)

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قلزمِ عشق میں ہیں نفع و سلامت دونوں
اس میں ڈوبے بھی تو کیا پار اترنا ہے یہی

---

(۱) ۱۹۱۶ء زمانہ نظربندی چھندواڑہ

قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی
اے اجل تجھ سے بھی کیا خاک رہے گی امید
وعدہ کرکے جو ترا روز مکرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسانِ بہشت
ہیں کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی
تجھ سے کیا صبح تلک ساتھ نبھے گا اے عمر
شبِ فرقت کی جو گھڑیوں کا گزرنا ہے یہی
ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست
قلبِ مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہرؔ
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

(۴)

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے

یہ حورِ بہشتی کی طرف سے ہے بلاوا
لبیک! کہ مقتل کا صلا میرے لئے ہے

کیوں جان دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

سرخی میں نہیں دستِ حنا بستہ بھی کچھ کم
پر شوخیٔ خونِ شہدا میرے لئے ہے

رحل ہوں مسلمان بصد نعرۂ تکبیر
یہ قافلہ یہ بانگِ درا میرے لئے ہے

انعام کا عقبیٰ کے تو کیا پوچھنا لیکن
دنیا میں بھی ایمان کا صلا میرے لئے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لئے ہے

اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت
پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے

اللہ کے رستے ہی میں موت آئے مسیحا
اکسیر یہی ایک دوا میرے لئے ہے

اے چارہ گرو چارہ گری کی نہیں حاجت
یہ درد ہی داروئے شفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

جو صحبت اغیار میں اس درجہ ہو بیباک — اُس شوخ کی سب شرم و حیا میرے لئے ہے
سہنے ظلم بہت عام ترا پھر بھی ستمگر — مخصوص یہ انداز جفا میرے لئے ہے

ہیں یوں تو فدا ابر سیہ پر سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لئے ہے

(دسمبر ۱۹۱۶ء)

(۵)

سینہ ہمارا فگار دیکھئے کب تک رہے
چشم یہ خونتابہ بار دیکھئے کب تک رہے

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں
پھر بھی ترا انتظار دیکھئے کب تک رہے

امت احمد کو ہے فضل کی تیرے امید
فضل کی امیدوار دیکھئے کب تک رہے

عشق سودہ ترا، صبر طلب ہے بہت
صبر ہمارا شعار دیکھئے کب تک رہے

سب کو یہاں ہے فنا، ایک تجھے ہے بقا
یہ ستم روزگار دیکھئے کب تک رہے

حق کی کمک ایک دن آہی رہے گی ولے
گردیں پنہاں سوار دیکھئے کب تک رہے

یوں تو ہے ہر سو عیاں آمدِ فصلِ خزاں
جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے

دین پہ دنیا فدا کرتے رہے مدتوں
کفر پہ ایماں نثار دیکھئے کب تک رہے

رونق دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی
یوں ہی یہ اُجڑا دیار دیکھئے کب تک رہے

پہلے رہا درد دل مونس جاں مدتوں
درد جگر اب کی بار دیکھئے کب تک رہے

زور کا پہلے ہی دن نشہ ہرن ہو گیا
زعم کا باقی خمار دیکھئے کب تک رہے[1]

ماتم شبیر ہے آمد مہدی تلک
قوم ابھی سوگوار دیکھئے کب تک رہے (۱۹۱۶ء)

---

(۱) ۱۹۱۵ء میں جب برطانیہ کو جرمنی کے مقابلے میں برابر شکستیں ہو رہی تھیں

(۶)

یہ جورِ ترا لا یہ جفا اور ہی کچھ ہے — یہ ظلم نہیں نامِ خدا اور ہی کچھ ہے

ہوں لائقِ تعزیر پہ الزام ہی جھوٹا — مجرم تو ہوں بیشک پہ خطا اور ہی کچھ ہے

ہو مکر و دغا لاکھ شعارِ اہلِ ہوس کا — پر شیوۂ اخوانِ صفا اور ہی کچھ ہے

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم — پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

ہم عیشِ دو روزہ کے بھی منکر نہیں لیکن — ایمائے شہِ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے

خود خضرؑ کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے — معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

بجتے ہی ہیں بے مہریٔ احباب کے شکوے — پر قاعدۂ صبر و رضا اور ہی کچھ ہے

تاخیر میں کچھ حرج نہیں پر یہ تو بتا دو — ہے مدِ نظر وصل بھی یا اور ہی کچھ ہے

اغیار کو ہو لذتِ آغاز مبارک — انجامِ محبت میں مزا اور ہی کچھ ہے

کرتا نہ کبھی ان پہ گماں اہلِ ہوس کا — عشاق کی نیت بخدا اور ہی کچھ ہے

نے سائلِ دولت ہیں نہ عزت کے طلبگار — اس در کے فقیروں کی صدا اور ہی کچھ ہے

اس شانِ تمرد سے نہ کھاتا کہیں دھوکا — اللہ کے مجرم کی سزا اور ہی کچھ ہے

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

یہ صدر نشینی[1] ہو مبارک تجھے جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

(۷)

اُس کو کیا خوف رہِ ظلمات سے
جس کی رہبر خود خدا کی ذات ہے

نذرِ جاں دیں چل کے طیبہ اپنے پاس
اُن کے لائق اک یہی سوغات ہے

قیدِ تنہائی کا لذت آشنا
کیسے کہہ دوں تارکِ لذات ہے

دل سے ہوتی رہتی ہیں سرگوشیاں
اب یہی اک مشغلہ دن رات ہے

کیا نہ ہوگی میری ہی حاجت روا
جس کا مولیٰ قاضی الحاجات ہے

تیرے بندے اُن پہ بھاری ہوں تو پھر
تیرا کیا کہنا تری کیا بات ہے

تیری رحمت پہ ہو جس کا آسرا
اُس کو کیا حزن و غم آفات ہے

قیدِ تنہائی میں بھی چھوڑا نہ ساتھ
نفسِ موذی بھی بڑا بدذات ہے

پرورش زیرِ پرستش کا ہے
پھر تو خودغرضی یہی خود لات ہے

مکر خیر الماکرین سے ہے عبث
اپنی چال اور آپ ہی کو مات ہے

---

(۱) ۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (کلکتہ) کے صدر مولانا ہی منتخب ہوئے تھے۔ حالانکہ اُس وقت چھندواڑہ میں نظر بند تھے

بہہ تو جائے توبہ گرمی میں مگر — سوچتا ہوں سامنے برسات ہے
اب خدا چاہے ہوئی جاتی ہے خیر — ایسی بھی کیا صورتِ حالات ہے
لے چلے ہیں اُس کی رحمت کا یقیں — اپنی تو صاحب یہی اوقات ہے

شمعِ ایماں کو خدا روشن رکھے
قبر میں جوہرؔ کی پہلی رات ہے

(۸)

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی
تم تو کعبے کے خدا تھے بجز نکالے کیوں گئے — اے بتو کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

(۱۹۱۶ء)

(۹)

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے — اک فقط تیرا سہارا چاہیے
دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ — دوستوں سے بھی مدارا چاہیے
ہے تقاضائے جنونِ پردہ در — خاک اُڑانا آشکارا چاہیے
ہے وہی فرمودۂ غالب کا پاس — ضبط کا کچھ اور یارا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

یہ صدر نشینی[1] ہو مبارک تجھے جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

(۷)

اس کو کیا خوفِ رہِ ظلمات ہے
جس کی رہبر خود خدا کی ذات ہے

نذرِ جاں دیں چل کے طیبہ اپنے پاس
ان کے لائق اک یہی سوغات ہے

قیدِ تنہائی کا لذت آشنا
کیسے کہہ دوں تارکِ لذات ہے

دل سے ہوتی رہتی ہیں سرگوشیاں
اب یہی اک مشغلہ دن رات ہے

کیا نہ ہوگی میری ہی حاجت روا
جس کا مولیٰ قاضی الحاجات ہے

تیرے بندے آن پہ بھاری ہوں تو پھر
تیرا کیا کہنا تری کیا بات ہے

تیری رحمت پہ ہو جس کا آسرا
اس کو کیا حزن و غمِ آفات ہے

قیدِ تنہائی میں بھی چھوڑا نہ ساتھ
نفسِ موذی بھی بڑا بدذات ہے

پرورشِ زینہ پرستش کا بنے
پھر تو خودغرضی یہی خود لات ہے

مکرِ خیر الماکریں سے ہے عبث
اپنی چال اور آپ ہی کو مات ہے

---

(۱) ۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (کلکتہ) کے صدر مولانا ہی منتخب ہوئے تھے۔ حالانکہ اس وقت چھندواڑہ میں نظر بند تھے

جود و سخائے ساقیِ کوثر کی دھوم ہے
ہم کو بھی ایک جام عطا ہو تو جانیے

مرنے کو یوں تو مرتے ہیں ہر روز سیکڑوں
اپنے لیے پیامِ قضا ہو تو جانیے

کہتے ہیں نقدِ جاں جسے عاشقوں پہ قرض
یہ قرض ہم سے جلد ادا ہو تو جانیے

ہر شے کو لے کے شکر کیا تو بھی کیا کیا
جان دیتے وقت شکر ادا ہو تو جانیے

دیوانہ ہو جو سنکر تہذیب ہو مگر
وہ سنّتِ شعر و سخن ہو تو جانیے

کٹ جائینگے یہ دن بھی یہاں قیدِ سخت کے
کم کچھ مگر وہاں کی سزا ہو تو جانیے

تیزی ہے اُس کی زخمِ جگر کے لیے فقط
ناخن سے وا وہ بندِ قبا ہو تو جانیے

شہد و شرابِ خلد میں یہ چاشنی کہاں
کچھ خونِ دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانیے

جانے کو یوں تو جاتی ہے تو عرش تک مگر
حاصل کچھ اس سے آہ رسا ہو تو جانیے

یوں منہ سے بڑبڑانے کو کہتے نہیں دعا
اِتمام ناسخی کی دعا ہو تو جانیے

سچا ہے اپنے وعدہ پہ جو ہر وہ بالیقیں
وعدہ ہمیں سے اپنا وفا ہو تو جانیے

(۱۳)

وہ جس سے کہیں ہم تجھے دل شاد کریں گے
سمجھو کہ اسے اور بھی برباد کریں گے

ہمانِ قفس کیا تری فریاد کریں گے
اتنی بھی نہ اب خاطرِ صیاد کریں گے

جو دشت کہ آرام گہِ سبطِ نبی ہے — اُس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

حریت کامل ہے، ولا بندگیِ حق — وہ تجھ کو غلامی ہی میں آزاد کریں گے

جو آرزوئے مرگ میں مرتے تھے وہ کشتے — کس منہ سے شکایت تری جلاد کریں گے

خوش کرنے کو قاتل کو ہم اور اشک بہائیں — ہاں زخمِ جگر ہنس کے اُسے شاد کریں گے

کہہ لینے دو دل کھول کے تا صبح کو نہ ٹوکو — کچھ اور بھی شاید ابھی ارشاد کریں گے

ہم جانتے ہیں لطف و عنایات کو اُن کی — ہوگا یہی کچھ اور بھی بیداد کریں گے

سب کہتے ہیں اکتا کے مساوات جفا ہے — وہ طرزِ ستم اور کیا ایجاد کریں گے

ہیں جن کی نگاہوں میں ازل سے ترے جلوے — وہ آرزوئے جنتِ شداد کریں گے؟

اے دل تجھے کچھ یاد بھی ہے عرش کا وعدہ؟ — تو یاد کر اُن کو، وہ تجھے یاد کریں گے

خارج نہ ہو گر حدِ ادب سے تو میں پوچھوں
جوہرؔ ہمیں کب خوش شہِ بغداد کریں گے

(۱۴)

محرم الحرام ۱۳۴۱ھ اگست ۱۹۲۲ء

گلہ اے دل! ابھی سے کرتا ہے — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے

جان دیتا ہے عیشِ فانی پر — بس، اسی زندگی پہ مرتا ہے

راحتِ جاوداں کو بھول گیا — کوئی دنیا میں یہ بھی کرتا ہے

عشق بن گر جئے تو خاک جئے
زندہ وہ ہے جو اُن پہ مرتا ہے

نام پر اُس کے سب جو لُٹا بیٹھا
وہی اِک ہے جو نام کرتا ہے

وقفِ مومن ہو آزمائشِ عشق
اس میں پورا وہی اُترتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا
وہی ناکام کام کرتا ہے

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان
کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

قولِ مومن ہو اُس کے فعل کی شرح
وہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے

مطمئن ہو، دلا، وہ جانِ جہاں
وعدہ کر کے کہیں مکرتا ہے

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ
یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے

آج کر لو جو کر سکو، کل تک
کون جیتا ہے، کون مرتا ہے

قلزمِ عشق میں گرا سو گرا
اس کا ڈوبا کہیں اُبھرتا ہے!

اس قدر احتیاط اے صیاد!
کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گزرتا ہے

مئے اسلام کا بھلا جو سُرور
نشہ چڑھ کر کہیں اُترتا ہے

(۱۵)

محرم الحرام سنہ ۱۳۲۹ھ، اگست سنہ ۱۹۱۱ء

مرا دل شور شیون سے در باغ جناں تک ہے
فغانِ بلبلِ نالاں بہارِ بے خزاں تک ہے

نہیں پالا پڑا، قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

تجھے ہے قوت بازوئے غستر صبر پر ہم کو
لگا دے زور تو سارا تری طاقت کہاں تک ہے

تکبر نے سکھایا ہے تغافل گر تجھے ظالم
تو آہ بھی پہنچ سن لے مکینِ لامکاں تک ہے

بھلا مایوس کیونکر اُس سے ہو امت محمدؐ کی
کہ جس نصرت کا وعدہ ہر ضعیف ناتواں تک ہے

یہ بادل کی گرج ہر دم، یہ بجلی کی چمک پیہم
نمائش سب کی سب بلبل یہ تیرے آشیاں تک ہے

ہمیں ثابت قدم نکلے، تو پھر اس کے قدم اُٹھے
یہ جبر و قہر کا جادو ہمارے امتحاں تک ہے

ابھی کیا ہے؟ ابھی اے دل ہزاروں امتحاں ہوں گے
ابھی تک ادعائے ضبطِ غم، تیرا زباں تک ہے

غنیمت ہو اگر باقی کہیں کچھ پاس مذہب ہے
ہماری آبرو جو کچھ ہے اس دھندلے نشاں تک ہے

اجابت کیوں نہ آئے عرش سے تا فرش، اگر جوہرؔ
دعا کا سلسلہ تیری زمیں سے آسماں تک ہے

(۱۶)

۲۲ محرم الحرام ۱۳۴۱ھ، ستمبر ۱۹۲۲ء

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین[1] کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہوگئی کیدِ متین کی

ایمان واقعی ہو اگر غیب پر تو پھر
بو آئے ہر امید سے حق الیقین کی

(۱) فتح سمرنا کے موقع پر لکھی گئی۔ مولانا اس وقت بیجاپور جیل میں قید تھے، اخبارات کی شکل سے بھی محروم۔ جیل بھی شہر کی آبادی سے فاصلہ پر تھا۔ ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی جاری تھی۔ ایک روز دور سے اللہ اکبر کے نعروں کی آواز سنائی دی۔ دل اندر سے خود گواہی دینے اٹھا کہ ہو نہ ہو آج ترکوں کی فتح سمرنا کی خبر آئی ہے۔ جوش میں آکر اسی وقت یہ غزل کہہ ڈالی کہنے کو تو کہہ ڈالی لیکن ڈرتے بھی جاتے تھے کہ کہیں یہ قیاس غلط نہ نکلے لیکن قیاس غلط نہ ثابت ہوا۔ اللہ نے واقعۃً "قیدیٔ گوشہ نشین" کی سن لی تھی۔

ہے نام مصطفیٰ کی یہ برکت کہ پھر خدا / یوں جڑ جما رہا ہے محمدؐ کے دین کی
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا / اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اُس کے بانی ہیں / کب لامکاں سے ہوگی مشیت مکین کی
ہم کو بھلا عزیز نہ ہو کیوں وہاں کی خاک / سرحد ملی ہے عرش سے جس سرزمین کی
اُس آستانِ پاک پہ گھستا ہے جل کے سر / سجدوں سے اور بڑھتی ہے زینت جبین کی
ہیں سب عرب یہیں شام فلسطین اور عراق / ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک دین کی
پھر خدا یہود و نصاریٰ کو دو نکال / یہ ہے وصیت اُس کے رسولِ امین کی
وہ انبیا کا مولد و مدفن سپرد ہے / ختم الرسل اور اس کی ہر اک جانشین کی
تینوں حرم ہیں آسکے جو ہے لاشریک لہ / ترکیب ہے درست یہی ایک حین کی
چودہ برس جو قبلہ رہا ہے رسول کا / قیمت ہے اپنا خون اُسی کی زمین کی
وہ خود ہی کہہ رہا ہے کہ مانگو مدد مگر / ایاک شرط یاد رہے نستعین کی
غافل خدا کے قہر سے دیتی نہیں پناہ / سدِ سکندری ہو کہ دیوارِ چین کی
تعظیم لازمی تھی شہیدوں کی ورنہ یوں / حرمت تھی نہ آنکھ خلد میں ہر حورِ عین کی
ہے خوش عمر آپ ہی منزل کے آس پاس / حاجت نہیں رکاب کی باقی نہ زین کی
کیا دی کے بعد جیل کا خلعت ... / کرتے نہیں تمسخر وہ مومنے ... کی
... / یارب کرا ... اطاعت ... کی

کس بوالہوس سے لینے چلے تم بھی دادِ عشق
جوہر حضورِ شیخ نے کی قدر بین کی!

(۱۷)

صفر ۱۳۴۱ھ، اکتوبر ۱۹۲۲ء

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی!
مظلوم کی دعا بھی کبھی بے اثر گئی؟

اگلی سی اب وہ زعم کی طغیانیاں کہاں
شب بھر میں کیا چڑھی ہوئی ندی اتر گئی

عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا
ہم بیکسوں کی آہ عجب کام کر گئی

ناکامیوں سے کام محبت کا بن گیا
اک دھات تھی کہ آگ میں پڑ کر نکھر گئی

جب طلعت و سعید و حلیم و انور و جمال[1]
چل دیں تو کیا جئیں کہ طبیعت ہی بھر گئی

مانا کہ یاں تک آنے کی فرصت نہیں تھی پر
پوچھو تو آج موت کہاں جا کے مر گئی

اپنی ہی عمر نے نہ وفا کی، وہ کیا کریں؟
ہم ہو چکے تو اُن کو ہماری خبر گئی

بیکارگی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے
اے دل نگاہ یار یہ کیسا سحر کر گئی؟

خونِ شہید اشکِ یتیم اب نہیں گراں
پھر کیوں نہ قدر قیمتِ لعل و گہر گئی

ساقی دورِ چرخ کب سے ہیں میخوار تشنہ لب
سن تو سہی وہ گردشِ ساغر کدھر گئی

صیاد کیا ہوئی وہ تری خُو تری احتیاط؟
مرغِ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی؟

---

(۱) ترکی کے مشہور مرحوم لیڈروں کے نام

تسکین وہ اسیرِ قفس تھا خیالِ گل — دو چار دن میں آپ طبیعت ٹھہر گئی
اے یادِ یار تیری رفاقت رہے گی یاد — آئی تھی پاس ہی شبِ ہجراں گزر گئی
کہنے نہ پائے وصل کی شب مدعائے دل — اک داستانِ غم تھی وہی تا سحر گئی

سامانِ زیب و زینتِ تن ہو چکا بہت
کچھ روح کی سنائیے، وہ بھی سنور گئی؟

(۱۸)

جمادی الاول ۱۳۴۱ھ، جنوری ۱۹۲۳ء

ہیں یہ انداز آزمانے کے — اور ہی ڈھنگ ہیں ستانے کے
کربلا ہے بہانۂ کوثر — جائیے صدقے اس بہانے کے
گھر چھٹا[1] یوں کہ چھوڑنے والے — تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک اک کر کے سب کے سب تنکے — ق — کئے برباد آشیانے کے
کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا — ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے
دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر — ق — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھئے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

---

(۱) مولانا کا داخلۂ وطن (رامپور) میں ممنوع ہو چکا تھا۔

قید میں اور اتنی بے باکی — سب یہ چھتّن ہیں مار کھانے کے
سن بھی لیتا جو حال دل وہ شوخ — آتے ہوں ڈھب اگر ستانے کے
جان کر قصہ کچھ سنے اوراق — جستہ جستہ مرے فسانے کے
دے کسی اور کو یہ دم قاصد — میرے گھر وہ کبھی نہ آنے کے
تیری گردش کہاں گئی اے چرخ — ہم ہیں محروم اک زمانے کے
خون عاشق سے سخت ہیں بیزار — ملک الموت اس زمانے کے
زنگ آلودہ ہو گئے سارے — ق — تھے جو آلات خوں بہانے کے
کھلے جاتے ہیں راز لیکن — روز دو چار جان جانے کے
تجھ سے سیکھے کوئی ستم ایجاد — طرز عشاق کے ستانے کے
کیوں ہو خوں ریز جس کو گر آئیں — عاشقوں کا لہو سکھانے کے
نار نمرود اک نہیں نہ سہی — سو طریقے ہیں دل جلانے کے
یہ بگڑتا ہے سب بناوٹ کا — منتظر ہیں فقط منانے کے
خود ہی بیٹھے ہیں یاں تو اٹھنے کو — اب گئے دن وہ ناز اٹھانے کے

چلئے جوہر کو چھوڑ تے "ناصح"
منہ لگے آپ کس دوانے کے

(۱۹)

جمادی الاول ۱۳۴۱ھ، جنوری ۱۹۲۳ء

اے دل! تجھی کو صبر جو پروردگار دے
تکلیف کیوں یہ کشمکشِ انتظار دے

بیڑے کو جس کے ڈر ہو یہ ناخدا نہیں
آساں ہے اس کے واسطے ڈوبے ابھار دے

دنیا اگر نہ چاہے تو یوں موت تک نہ دے
دینے پہ لیکن آئے تو پھر بے شمار دے

راضی ہیں جو رضائے الٰہی میں ان کو کیا
جو چاہے ان کو گردشِ لیل و نہار دے

ہم اُس کے ہو لیے تو پھر اب اس سے کیا غرض
وہ جیت اپنی فوج کو دے یا کہ ہار دے؟

تا ہم کریں نہ عرض تو ناچار کیا کریں
جب چین ہی نہ ہم کو دلِ بے قرار دے

سینچا تھا اس کو اپنے لہو سے حسینؑ نے
اب چاہے اس چمن کو خزاں دے بہار دے

اے حاملِ شریعت کا بل ہو سر بھی نذر
یا چاہتا ہے بوجھ ہی سر سے اتار دے؟

تو کس خیال میں ہے یہ عشق ہی نہیں
اے بوالہوس جو فرصتِ بوس و کنار دے

نعلین ہی تو ہیں نہ کہیں کشفِ کلیم
اس آستاں پہ آئے تو سر بھی اتار دے

تجھ پر بد اثر نہ سخت ہو اے دل عدو فقط
ہو اس لئے کہ وہ تری چاندی نکھار دے

لغزش نہ ہو جو تیرے کبھی پائے ثبات کو
ہو تو ہی کامیاب وہ ایذا ہزار دے

دے نقد جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یوں مے ادھار دے

کٹتی ہے شغلِ عشق میں پل بھر میں عمرِ خضر یہ دن ہی کیا ہیں قید کے اے دل گزار دے
رہرو تھا راہِ عشق کا منزل کو پا لیا اب اور کیا نشان مری لوحِ مزار دے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

(۴۰)

رجب، شعبان، رمضان ۱۳۴۱ھ، مارچ و اپریل ۱۹۲۳ء

عرش تک جو بے خطا جاتا ہے یہ وہ تیر ہے
غیر سمجھا ہے کہ میری آہ بے تاثیر ہے
خوگرِ قیدِ وفا پر کھل چکا زنداں میں راز
جرم تھی وہ قید، یہ اُس جرم کی تعزیر ہے
بے گناہی سے بھی بڑھ کر ہے اگر کوئی گناہ
تو سزائے عشق پا کر خجلتِ تقصیر ہے
چھوڑ میری فکر غافل، رو خود اپنی قید پر
جس کو تو زیور سمجھتا ہے وہی زنجیر ہے!

سحر و جنت، دونوں اے کافر ہیں اس دنیا کے نام
وہ ازل سے بخت مومن، یہ تری تقدیر ہے

دار ہی بنتی ہے، اے دل زینۂ معراج عشق
خوابِ آغازِ محبت کی یہی تعبیر ہے

ہو نہ الجھن جیب جنوں جامہ در کامل نہ ہو؟
جب تلک دامن سے خار دشت دامنگیر ہے

ہاتھ تو ہوں گے قلم، پر نامہ بر یہ بھی کہا؟
دل چرا لیتی ہے پہلو سے یہ وہ تحریر ہے

پائداری میں ہے قصروں سے سوا مجنوں سی قبر
جو قیامت تک رہے قائم یہ وہ تعمیر ہے

خون ناحق کا کسی کے سینہ اور تم پر؟ مگر
سینۂ جوہر میں دیکھو تو یہ کس کا تیر ہے

(۲۱)

قید ہے، جوہر کہ بیجاپور کی تسخیر ہے؟
گولکنڈے بھی جو جا پہنچے تو عالمگیر ہے

اے مسیحا، اس مرض سے کون چاہے گا شفا
دار پر موت آئے اس کی بھی کوئی تدبیر ہے
اے مسلماں، تو تو مسجود ملائک تھا کبھی
پھر یہ شیطاں کی غلامی کیوں تری تقدیر ہے
کیا نہیں واقف ابھی اسلام کی تاریخ سے؟
انّ مع العسر یسراً ہی کی سب تفسیر ہے
ہو محمد کیوں نہ قرآں اور بھی ہم کو عزیز؟
اُس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے
دین میں اکراہ کیسا؟ ہاں برائے حفظ دیں
دل میں قرآں ہے ہمارے ہاتھ میں شمشیر ہے
لیس للانسان الّا ماسعیٰ کو یاد رکھ
کر توکل پھر تری تدبیر ہی تقدیر ہے
یا الٰہی طوقِ لعنت ہو نہ گردن میں وہاں
غم نہیں گر یاں ہمارے پاؤں میں زنجیر ہے
سحر کاری سوزِ دل کی داد پائی ہے زباں!
سب یہی کہتے ہیں کیا جادو بھری تقریر ہے

حیف جو ہر ماسوا سے اور یہ بیم و رجا؟
جو کبھی بخشی نہ جائے گی یہ وہ تقصیر ہے

(۲۲)

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے
ذرا پر باندھنا صیاد کَس کے

نشانِ آشیاں کیا جس چمن میں
لگے ہوں ڈھیر پر سو خار و خس کے

ملے اک خم تو میخانے سے ساقی!
کہ ہم چھوٹے ہوئے ہیں دو برس کے

گراں ہو اب تو شاید سیرِ گل بھی
کچھ ایسے ہو گئے خوگر قفس کے

ملی ہے قید آزادی کی خاطر
نہ پڑ جائیں کہیں دونوں کے چسکے؟

جو رہنا چاہیے بندِ غم سے آزاد
پھنسے پھندے میں کیوں تارِ نفس کے

مئے کہنہ ملے گی مسجدوں میں
یہ میخانے ہیں یا تیرہ سو برس کے

فرشتوں نے کیا ہے ان کو سجدہ
نہیں اے بت یہ بندے تیرے بس کے

جو کھو بیٹھا متاعِ عزتِ نفس
برابر ہو گیا جو رو و ناکس کے

ملے اب دیکھیے کب جامِ کوثر؟
یہاں تو رہ گئے سیکش برس کے

گھٹیں کیا حبِ ملک و عشقِ مذہب؟
نشے ہیں یہ بھی کیا چانڈو چرس کے

جو سچ ہے وعدہ جودی تو یہ مینہ
کھلے گا اک نہ اک دن خود برس کے

نہیں باقی رہا جب پاس آئین مٹے سب آمر ستی دزد و عسس کے
چمن تو ہم نے خود چھوڑا ہے کبھی گلے پھر کیا کریں قیدِ قفس کے
گیا اتنے میں خود تارِ نفس ٹوٹ
تھے جو ہم منتظر اک ہم نفس کے

(۴۳)

جنوں ہی سے نہ گر بالکل دلِ دیوانہ خالی ہے
نہ مانوں گا اثر سے نعرۂ مستانہ خالی ہے
اثر سے گر کسی کا نعرۂ مستانہ خالی ہے
تو پھر سمجھو جنوں سے بھی دلِ دیوانہ خالی ہے
مروت سے تری ہم بیکسوں کی شرم رہ جاتی
بھری محفل میں ساقی ایک ہی پیمانہ خالی ہے
وہ اچھا ہی سہی پر اب تو دل لگتا نہیں اس میں
جو ذکرِ عشق و دردِ ہجر سے افسانہ خالی ہے
یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور پیمانہ خالی ہے

ہماری خاک کو کیا خاک ڈھانکے گا کہ خود تجھ سے
ابھی اے بوئے الفت! سبزۂ بیگانہ خالی ہے

دلا! ڈر ہے کہیں کعبہ پہنچ کر تو نہ کہہ بیٹھے
کہ واپس چل یہاں سے اب تو یہ بیت خانہ خالی ہے

تری محفل میں ہوں یوں ایک سے اک بڑھ کے فرزانہ
مگر افسوس! جائے عاشقِ دیوانہ خالی ہے

نہیں ذوقِ اسیری چھوڑتا ہے کب گلستاں میں
قفس میں جب تک اے صیاد کوئی خانہ خالی ہے

یہ مانا ہم نے جو ہر شہر چھوڑا، پر کہاں جائیں
وہ تیرے دم سے تھا آباد، اب ویرانہ خالی ہے

(۲۴)

شعبان المعظم ۱۳۴۱ھ مارچ ۱۹۲۳ء

قید اور قید بھی تنہائی کی — شرم رہ جائے شکیبائی کی!
سوجھتا کیا ہمیں ان آنکھوں سے — شرح تھی قلب کی بینائی کی
در بت خانہ سے بڑھنے ہی نہ پائے — گرچہ اک عمر جبیں سائی کی

قیس کو ناقۂ لیلیٰ نہ ملا — گو بہت بادیہ پیمائی کی
ہم نے ہر ذرّہ کو محمل پایا — ق — ہے یہ قسمت ترے صحرائی کی
وقف ہو اُس کے لئے جانِ عزیز — کعبہ کے خادم و شیدائی کی
کعبہ و قدس میں گھر کیا؟ یہ بھی — اِک ادا ہے مرے ہرجائی کی
نظر آیا ہمیں ہر چیز میں تو — اُس پہ یہ دھوم ہے یکتائی کی
عشق اور جورِ ستمگر کا گلہ؟ — حد ہے اے دل! یہی رسوائی کی
عقل کو ہم نے کیا نذرِ جنوں — عمر بھر میں یہی دانائی کی
کر گئی زندۂ جاوید ہمیں — تیغِ قاتل نے مسیحائی کی
ہو نہ تقلید، دلا! مقتل میں — کہیں موسیٰ سے تمنائی کی
نہ سہی تیغ، تجلی ہی سہی — ق — آنکھ جھپکے نہ تماشائی کی

کل کو ہے پھر وہی زنداں جوہرؔ
ٹھیک کیا آپ سے سودائی کی

(۳۵)

رجب ۱۳۴۱ھ، مارچ ۱۹۲۳ء

مژدۂ فتح اک پیغامِ جناں لایا ہے — کچھ تو میرے لئے ماہِ رمضاں لایا ہے

میکشو مژدہ اک جس سے پلٹ آتا ہے شباب
وہی سوغات پھر اب پیرِ مغاں لایا ہے

خوش ہیں مرغانِ چمن کنجِ قفس میں بھی مگر
تو کہاں سے ہمیں اے عشق کہاں لایا ہے؟

مژدۂ صدق کی تعبیر ہے خود مخرجِ صدق
یہ بھی جائیگا یہاں سے جو یہاں لایا ہے

حکمراں خلق پہ ہوگا وہی جس کا مذہب
خلق کے واسطے عیش و جہاں لایا ہے

شکوہ صیاد کا بیجا ہے قفس میں بلبل!
یاں تجھے آپ ترا طرزِ فغاں لایا ہے

عشق تو اپنا خود انجام ہے پر تو ناصح
اور اک مسئلہ سود و زیاں لایا ہے

سعد سوسی چھٹے شوقِ شہادت میں عدو
لینے جاتا ہے جہیز اسپِ سناں لایا ہے

ہم اسیرانِ قفس کب تھے ممنونِ ہوا
رنگ پھر آج تو کچھ دردِ نہاں لایا ہے

کرمِ غیر کے خوگر تو نہ تھے ہم اے چرخ
خیر ہے آج یہ کیا بارِ گراں لایا ہے؟

خوگرِ جور تھے ہم، پر کرمِ غیر یہ کیا
کیوں فلک آج یہ کیا بارِ گراں لایا ہے

(۳۶)

شعبان ۱۳۴۱ھ، مارچ ۱۹۲۳ء

کافر ہنسی اڑائیں خدا کے وعید کی
ساعت نہ پر ٹلے گی عذابِ شدید کی

جب تک کہ دل سے تو نہ ہو کربلا کی یاد
تجھ سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

یہ راہِ خلد خود ہی نہ بھاتے ہمیں مگر
دعوت تو سب کو دیتی ہے تربت شہید کی

قائل نہ ہم ہوں کیسے مع العسر یسر کے؟
اے دل یہ صیام ہے تقریب عید کی

شکر خدا کہ جس نے پس از ظلمت فراق
پہلی جھلک دکھائی یہ صبح امید کی

کیا دے صلہ صبا کو پیام بہار کا؟
مژدہ قفس کی جان ہے نذر اس نوید کی

سائل کو اذن عام ہے اُس بارگاہ میں
کچھ پوچھ واں نہیں ہے قریب و بعید کی

تنہائی کیسی قید میں؟ ہے وہ جو ہم سخن!
کر تو تلاوت اُس کے کلام مجید کی

تو جس کو مل گیا اسے ہر چیز مل گئی!
بڑھیا یہ گر بتا گئی ہارون رشید کی

ہے خواب میں بھی حسرت پیمبر تجھے حجاب
جوہر کو آرزو ہی رہی تیری دید کی

(۲۵)

گویا ہے لاش بھی تو تمہارے شہید کی
پیہم صدا البتہ ہے ھل من مزید کی

ہر سنگ در پہ ہم نے جھکائے تھے بعد سر
سجدے کا رفرش کعبہ کی مٹی پلید کی

ہیں شوق کی اگر یہی امیدواریاں
نوبت کب آئے دیکھئے گفت و شنید کی

رکھ دیکھیں ہم دریغ عظام رمیم کو
قدرت خدا میں کب نہیں خلق جدید کی

الطاف[1] بھی ہیں گرچہ فرنگی محل میں خوش — پر بات ہی کچھ اور ہے عید سعید کی
ممکن نہ ہو دوگانہ، سوّیاں نہوں نصیب — زنداں میں ہے دوچند خوشی پھر بھی عید کی
اُن[2] کا کرم بھی ان کی کرامت ہے ورنہ یوں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

(۲۸)

شعبان و رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ اپریل و مئی ۱۹۲۲ء

جاں توڑ سکتے ہیں، زینت نہوں درباروں کی
ہو نہ اب اتنی بھی اوقات وفاداروں کی؟
زخم دل کا انہیں بھولے سے بھی آیا نہ خیال
کون لیتا ہے دعا ایسے نمک خواروں کی؟
کہہ دو رضواں سے نہیں سایۂ طوبےٰ درکار!
اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں میں تلواروں کی

---

(۱) مولوی الطاف الرحمٰن صاحب اور مولوی سعید الرحمٰن صاحب قدوائی کی طرف اشارہ ہے۔
(۲) مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی طرف اشارہ ہے۔

بوجھ میرا نہ اٹھائے کوئی محشر میں تو کیا؟
دستگیر آپ جو رحمت ہے گنہگاروں کی

ہے محمد کی شفاعت تو خدا کی رحمت
حشر کیا عید ہے امت کے گنہگاروں کی!

روز کچھ مرتے ہیں، پھر بھی نہیں درماں کا خیال
حالت اچھی ہے ابھی آپ کے بیماروں کی

سرفروشانِ جفاکش کے سروں کی قیمت
اور بھی بڑھ گئی قلت سے خریداروں کی

کر چکے پانوں تو ہم آئی خارِ صحرا
سر بھی دعوت کرے اب شہر کی دیواروں کی

ایک ہی دو سہی، پر کچھ تو پہنچتیں دل تک
نوکیں رہ جاتی ہیں سب پانوں میں کیوں چھالوں کی؟

کہہ دو ان گوشہ نشینوں سے بھریں گوشۂ قبر
نہیں دنیا میں جگہ آپ سے بے کاروں کی

تو وہ خاک ابھی اک قبر کو میری ہے بہت
اس عمارت کو ضرورت نہیں معماروں کی

ساقیا! ابر بھی ہے اُسے بھی ہے اور تو بھی ہے مست
آج بر آئیں مرادیں ترے مے خواروں کی

جب نہیں وعدے کو ایفا سے ذرا بھی سروکار
پھر کمی کیا ہے تمھارے لئے اقراروں کی

(۳۹)

کبھی[1] چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے

کثرتِ شوق سے تھا ہجر بھی ہم رنگِ وصال
ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے

---

(۱) مولانا کے برادرِ مکرم ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر سے مولانا اور نیز شوکت علی صاحب کو اپنے زمانۂ نظر بندی اور بیتول جیل میں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔ ذوالفقار علی خاں صاحب نے ان شکایات کا جواب ایک غزل میں دیا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

جور اعدا کے گلے تری جدائی کے گلے　　　اس دل تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے
(گوہر)

مولانا نے۔ گلے شکووں کا جواب بڑے مزے سے اپنے انداز میں لکھا ہے۔

کششِ شوق بھی تھی اور لذّتِ بُعدِ منزل
سب طرف خار تھے اور آبلہ پائی کے مزے

طبع آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی
قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

مجھے ہر سجدہ کو معراج جو زاہد چکھ لے
در توبہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے

آگئی وادیٔ پُرخار بڑھا دو تو قدم
پھر نہ کہنا نہ ملے راہ نمائی کے مزے

میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں
بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے

درگہ حسن پہ سب ایک ہیں محمود و ایاز
بادشاہوں کو بھی ملتے ہیں گدائی کے مزے

شعر جوہر کی ہو کیا قدر سخن سازوں کو
ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

(۳۰)

مولانا مرحوم کی آخری غزل

جو مجھے دردِ آشنا کر دے ۔۔۔ اے خدا نالہ وہ عطا کر دے

اب تو لے دے کے یہ تمنا ہے ۔۔۔ میرے حق میں کوئی دعا کر دے

کوئی اتنا نہیں زمانے میں ۔۔۔ جو مرے درد کی دوا کر دے

مجھکو تم اس نگاہ سے دیکھو ۔۔۔ جو تمھیں دردِ آشنا کر دے

اب بھی اتنا اثر ہے نالہ میں
حشر میں حشر اک بپا کر دے

مصنفہ

مولوی رئیس احمد صاحب جعفری (جامعی)

مع مقدمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مدیر "صدق"

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کئے اگر یہ سوال پیدا ہو کہ بلحاظ جامعیت ان میں سے سرفہرست کس کو بنایا جائے اور کون ہے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جا سکتا ہے اور وہ نام محمد علی کا ہوگا۔

انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے اور انسانی شخصیت کا سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا اسی نسبت سے دشوار۔ پھر مولانا محمد علی جیسی جامع شخصیت کے سوانح حیات لکھنا دشوار تر تھا لیکن قابل مرتب نے تمام واقعات کو اس خوبی سے ترتیب دیا ہے کہ اس آئینہ میں عہد حاضر کی پوری تاریخ نظر آتی ہے کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ دو ہزار کا ایڈیشن چند ماہ میں قریب قریب فروخت ہوگیا۔ اب کتاب کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے قیمت ۳؎

مکتبہ جامعہ دہلی

مولانا محمد علی کی متفرق کتابیں

سنہ ۲۱ء کے سیاسی ہیجان میں عام اشاعت کے لئے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف تحریریں اور تقریریں آل انڈیا خلافت کمیٹی کی جانب سے شائع ہوئی تھیں چند رسالے مختلف اداروں یا افراد نے بھی چھپوائے تھے جو اب نایاب ہیں۔ مکتبہ جامعہ کو جہاں جہاں سے بھی جس قدر کتابیں مل سکیں حاصل کرلیں۔ شائقین طلب فرمائیں:-

تقاریر حصہ اول ۸ر

تقریر مدراس ۳ر

بیان کراچی ۴ر

خطبہ صدارت (دہلی و لکھنؤ) ۵ر

چند اہم خطوط ۳ر

قومی و اسلامی تعلیم کا انتظام ۴ر

ایڈریس خلافت ڈیلیگیشن (لندن) ۴ر

مکتبہ جامعہ دہلی

خطبہ صدارت

(کوکناڈا)

انگریزی کے زبردست اہل قلم، ہندوستان کے قائد اعظم صاحب فکر و نظر، رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا فاضلانہ خطبہ صدارت جو آپ نے کوکناڈا کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پڑھا تھا۔

یہ وہ خطبہ ہے جو اپنے مغز و تسلسل کے اعتبار سے اور اپنی زبان و انشا کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ صرف چند کاپیاں باقی ہیں۔ آپ بھی ایک کاپی اپنے واسطے محفوظ کر لیجئے ورنہ کسی قیمت پر نہ ملے گی۔

قیمت

انگریزی اڈیشن . . عہ/

اردو اڈیشن . . عہ/

مکتبہ جامعہ دہلی

[illegible]

ح ۲۴۲ ۸۹۱۵۶۳۱۷

(ج ت)

۳۲۰۳۱

Date	No.	Date	No.